

# حسابِ دل رانے وا

نہیدہ عزیز



www.paksociety.com

## حسابِ دل رہنے دُو

”سر! پلیز اس فائل میں آپ کے سائن چاہئیں یہ فائل آج ہی بینک بھجوانی ہے، منیجر صاحب کا فون آیا تھا۔“ اس نے عارفین شیرازی کو فون کال بند کرتے دیکھ کر فوراً ہی اپنا کام کہنا شروع کر دیا تھا اور ساتھ ہی فائل اس کے سامنے ٹیبل پر رکھ دی تھی۔

اس نے فائل اٹھا کر چیک کی اور پھر بینک کا کیپ ہٹا کر فائل پر سائن بھی کر دیئے تھے۔

”اور کچھ؟“ وہ ڈائریکٹ اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

”جی سر! مسز ہمدانی نے یہ فیکس بھیجا ہے۔“ اس نے دوسری فائل کھول کر فیکس بھی اس کے سامنے رکھ دیا تھا۔

”اوکے.....“ وہ آہستگی سے بولا تھا۔

”کیا اب میں جاسکتی ہوں؟“ وہ جانے کے لئے پرتول رہی تھی۔

”ہوں!“ وہ کسی سوچ میں گم صرف سر ہی ہلا رہا تھا اور وہ تیزی سے پلٹ گئی تھی۔

”اروئی! رکو میری بات سنو۔“ اپنی سوچ، اپنے دھیان سے نکلنے ہی اس نے بے ساختہ اروئی کو پکارا تھا اور اس کا ہاتھ ہینڈل گھماتے گھماتے تھم گیا تھا۔

”جی سر؟“ اس نے پلٹ کر انتہائی نارمل سے انداز میں پوچھا تھا۔ لیکن اب وہ خاموش ہو چکا تھا کہ کیا کہے؟ کیونکہ کہنے کو تو بہت کچھ تھا، مگر

کہنے کا..... صحیح وقت نہیں تھا۔

”کیا اب میں جاسکتی ہوں؟“ اس نے دُہرا کر پوچھا تھا۔

”ہوں؟ نہیں بیٹھو یہاں۔“ اس نے ”آپ“ کو ”تم“ میں بدلنے ہوئے کرسی کی سمت اشارہ کیا تھا۔

”سر! میری ٹیبل پر اس وقت کافی سارا کام ادھورا پڑا ہے، سو پلیز لٹ می گو۔“ وہ بے حد سنجیدہ اور دو ٹوک لہجے میں کہہ رہی تھی اور وہ اس

کے انداز پر لب بھینچتے ہوئے خود کو کنٹرول کرتا اپنی چیئر دھکیل کر اس کے مقابل آکھڑا ہوا تھا۔

”اروئی! تمہیں شاید اندازہ نہیں ہے کہ جس حقیقت سے تم دامن چھڑا رہی ہو، نظریں چراہی ہو، میں اس حقیقت کو ہر زاویے سے، ہر لحاظ

سے قبول کر چکا ہوں۔“ عارفین شیرازی کا لہجہ کافی مضبوط تھا۔

”کون سی حقیقت سر؟“ وہ بے حد اجنبیت اور لاتعلقی کا مظاہرہ کر رہی تھی۔



”تم اچھی طرح جانتی ہو روئی اپلیز اس طرح بات نہ کرو۔“ عارفین کے لہجے میں پل میں تھکن اتر آئی تھی۔

”سر میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ ہمارے درمیان جو کچھ بھی ہوا ہے وہ ایک ”ڈرامہ“ تھا اور اس ڈرامے میں دو کریکٹر تھے روئی حیات اور عارفین شیرازی اور ان دونوں کریکٹرز کا اپنے آپ پہ کوئی اختیار نہیں تھا، ان کا تمام دار و مدار اور اختیار اس ڈرامے کی ڈائریکٹر اور پروڈیوسر کے ہاتھ میں تھا، یعنی زونلڈ شیرازی اینڈ رابعد شیرازی کے ہاتھ میں..... اور اب جب اس سوپ سیریل کا اختتام..... ہو چکا ہے تو آپ اسے ریپیٹ کیوں کرنا چاہتے ہیں؟ ایک ڈرامہ ایک بار ہی ہٹ ہوتا ہے، بار بار ریپیٹ کرنے سے نہیں..... پلیز بھول جائیں اس بات کو کہ جو گزرا وہ حقیقت تھی، بلکہ اس بات کو ذہن میں رکھیں کہ جو ہوا وہ ”ڈرامہ“ تھا۔ ایک ڈرامہ ختم ہو تو دوسرے ڈرامے کی تیاری کی جاتی ہے، پلیز آپ بھی کسی نئے ڈرامے پہ توجہ دیں اور پھر سے تیاری شروع کر دیں۔“

اروئی نے کافی پنے تلے اور کھرے کھرے لفظوں میں اسے اپنی اہمیت اور دائرہ سمجھا دیا تھا۔ جس پہ چند سیکنڈز کے لئے عارفین شیرازی کچھ بھی نہ کہہ پایا تھا۔

”تم آخر چاہتی کیا ہو؟ تم نے کیا سوچا ہے اس سارے قصے کے بارے میں؟“ عارفین کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ اروئی کو کیسے سمجھے اور اسے کیسے سمجھائے؟ شاید ان کی کیفیات، تاثرات اور جذبات اس مقام پہ تھے جہاں لفظوں کا دائرہ اور اظہار کا پیرا بن بھی کم پڑ جاتا تھا، بالکل اسی طرح عارفین شیرازی ٹھیک سے اظہار نہیں کر پا رہا تھا اور اروئی اس کے احساسات کو سمجھ نہیں پا رہی تھی اور اسی بات پہ وہ جھنجھلا اٹھتا تھا۔

”میں تم سے کچھ پوچھ رہا ہوں اروئی کہ تم خود کیا چاہتی ہو؟“

”آپ مجھے بار بار ڈسٹرب کرنا چھوڑ دیں۔“ وہ تیزی سے بولی تھی

”اور جو میں ڈسٹرب ہو رہا ہوں؟ میری زندگی سکون سے عاری ہو چکی ہے؟ کیا اس کا احساس نہیں ہے تمہیں؟“ وہ بے بسی سے مٹھیاں بھینچتا دے لہجے میں جیسے پھر رہا تھا۔

”سر! آپ اپنے ذاتی معاملات میں مجھے مت گھسیٹا کریں، میں آپ کی پی اے ہوں، میرا تعلق آپ کے کاروبار، آپ کے آفس اور آپ کے دیگر کاموں سے ہے۔ آپ کی ذات سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے اور پلیز وقت بے وقت کوئی ڈرامہ ری ایکٹ کرنے سے پہلے یہ سوچ لیا کریں کہ یہ آفس ہے آپ کا بیڈروم نہیں۔“

”سٹ اپ روئی! جسٹ سٹ اپ۔“ عارفین شیرازی کا ہاتھ اٹھا، لیکن پھر اس نے اپنے ہاتھ کو فضا میں ہی روک لیا تھا۔

”تم سے بات کرنے کے لئے مجھے کسی آفس، کسی بیڈروم کی حدود کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں جب چاہے، جہاں چاہے تم سے بات کر سکتا ہوں۔“ وہ کافی غضب ناک لہجے میں کہتا دروازے کو ٹھوکر مارتا ہوا روئی سے پہلے آفس سے باہر نکل گیا تھا اور اروئی پہلی بار اس کا اس قدر شدید غصہ اور جذباتی انداز دیکھ کر چپ کی چپ رہ گئی تھی، یہ اس کے غصے کی انتہا ہی تھی کہ وہ آج اس پہ ہاتھ اٹھا بیٹھا تھا، بے شک یہ تھڑاس کے چہرے پہ نہیں پڑا تھا، مگر اس تھڑک کا احساس عارفین کو بھی ہو گیا تھا اور اروئی کو بھی۔



”السلام علیکم!“ ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی ہمیشہ کی طرح ذرا اونچی آواز سے سلام کیا تھا، اور بابا جان نے چونک کر اس کی سمت دیکھا تھا، وہ کافی ڈھیلے ڈھالے انداز سے بریف کیس صوفے پہ ڈال کر ٹائی کی ناٹ کھول رہا تھا۔

”تھک گئے ہو؟“ اس کے سلام کا جواب دے کر وہ پوری طرح سے اس کی سمت متوجہ ہوئے تھے۔

”شاید.....“ وہ بے حد اہستگی سے بولا اور صوفے کی بیک سے پشت ٹکا کر پکلیں موندتی تھیں۔

”عارفین! تم اپنے اندر کا حال کیوں نہیں بتاتے؟ صبح گھر سے آفس کے لئے نکلتے ہوئے بہت تازہ دم، زندگی سے بھرپور ہوتے ہو، لیکن واپسی پہ اک بارے ہوئے جواری کی طرح نظر آتے ہو۔ مجھے بتاؤ آخر تم کیا چیز ہار کے گھر آتے ہو؟ ایسی کیا چیز ہے جو تمہیں خوش نہیں رہنے دیتی؟ پہلے تمہاری اولاد نہیں تھی، لیکن تم خوش رہتے تھے، اب اللہ نے یہ کمی بھی پوری کر دی ہے، تمہیں چاند سا بیٹا دیا ہے، لیکن پھر بھی تم خوش نہیں ہو؟ کیا وجہ ہے آخر؟“ بابا جان ہاتھ میں پکڑی کتاب ایک سائینڈ پر رکھتے ہوئے اپنی گہری نگاہوں سے اس کا بغور جائزہ لینے لگے۔ جبکہ عارفین کے دل میں ایک سر دلہراٹھی تھی۔

”بابا جان آپ کی خواہش اور اپنی ماں کی ضد نے ہی تو مجھے اس قدر ہارنے پہ مجبور کیا ہے، اب میں اپنے اختیار میں نہیں ہوں تو میں کیا کر سکتا ہوں، میں آپ لوگوں میں سے کس کو دوش دوں؟ کون مجرم ہے میرا؟ آپ لوگ یا پھر میں خود؟“ اس نے بے بسی سے سوچا تھا۔

”عارفین بولو کیا ہار کے آئے ہو؟“ بابا جان اسے کھوجنا چاہتے تھے۔

”اپنی زندگی، اپنا دل.....“ وہ بہت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں آہستگی سے بولا تھا اور بابا جان اس کے جواب پہ اُلجھ کے رہ گئے تھے، شک تو انہیں پہلے سے تھا، اب وہ ان کے شک کو یقین دے رہا تھا۔

”تمہارا مطلب ہے تم اپنی زندگی یعنی اپنا سب کچھ ہار کے گھر آئے ہو؟“ انہوں نے باقاعدہ دُہرا کر پوچھا تھا۔

”ہاں شاید یہی کہا ہے۔“ عارفین نے آنکھیں کھول کر چھت سے لٹکتے بے حد خوبصورت اور بیش قیمت فانوس کو دیکھتے ہوئے جس لہجے میں کہا تھا بابا جان کو اور بھی بے چینی لگ گئی تھی۔

”ہمارا تو خیال تھا کہ تمہاری زندگی اس گھر میں ہوتی ہے، تمہاری بیوی، تمہارا بچہ، تمہاری ماں، تمہارے دادا، دادی، تمہارا سب کچھ یہاں ہے، پھر باہر تمہاری زندگی.....“ انہوں نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑی تھی۔

”یہاں اس گھر میں میری زندگی نہیں بلکہ زندگی کے چند حصے رہتے ہیں، جبکہ میری پوری زندگی اور زندگی کا حاصل اس گھر سے دور ہے میں اپنی زندگی کو اور زندگی کے تمام حصوں کو بچھا کر ناچاہتا ہوں، ایک جگہ رکھنا چاہتا ہوں، میں ایک مکمل زندگی جینا چاہتا ہوں بابا جان..... لیکن مجھ سے ایسا ہو نہیں پا رہا، مجھ سے میری زندگی کے حصے سمٹ نہیں پارے، بلکہ اور بھی بکھر رہے ہیں اور ان کے ساتھ ساتھ میں بھی بکھر رہا ہوں، مجھ پہ کیا بیت رہی ہے میں بیان نہیں کر پارہا، میں بے بسی کی انتہا پہ ہوں اس وقت۔“ وہ اضطرابی انداز سے کہتا صوفے سے کھڑا ہو گیا تھا، دونوں ہاتھ اپنے بالوں میں پھنسا لئے تھے، اس کی بے چینی اور بے بسی اک اک حرکت سے عیاں تھی۔



”کوئی نام بھی تو ہوگا تمہاری زندگی کا؟“ بابا جان کے سوال پہ وہ بُری طرح چوٹک گیا تھا اور جب احساس ہوا کہ وہ ”کس“ کے سامنے کھل رہا ہے تو فوراً ہی اپنے آپ کو اس سنگین حماقت سے روک لیا تھا اور اپنی کیفیت کنٹرول کرنے لگا تھا۔

”حانی! حانی کہاں ہے نظر نہیں آ رہا؟“ وہ بڑی مہارت سے بدل گیا تھا۔

”عارفین ہم نے کچھ اور پوچھا ہے؟“ بابا جان نے زور دے کر کہا تھا۔

”وہ سب بھی ہوتا رہے گا بابا جان ابھی میں اس سے تول لوں، روز وہ یہاں ہی ہوتا ہے ڈرائنگ روم میں، لیکن آج کہیں دکھائی نہیں دے رہا، میں ابھی آتا ہوں اسے دیکھ کر۔“ عارفین نے وہاں سے نکلنے میں تین سیکنڈ کا وقت لیا تھا اور بابا جان اپنے پوتے کی ذہری شخصیت کے..... پرزے جوڑتے ملا تے رہ گئے تھے۔

وہ بہت دنوں سے اس پہ غور کر رہے تھے، لیکن ابھی تک کوئی سراغ ہاتھ آ کے نہیں دیا تھا۔ حالانکہ کبھی کبھی عارفین کا خود دل چاہتا تھا کہ وہ سب کچھ بابا جان کے سامنے بیان کر دے، اپنے دل کے نہاں خانے میں چھپے تمام اچھے بُرے راز ان کے حضور کھول کے رکھ دے، مگر حوصلہ کرتے کرتے پھر سے ہمت ہار جاتا تھا۔ صرف یہ سوچ کر سب کچھ جان لینے کے بعد نہ جانے ان کا رد عمل کیا ہوگا؟ وہ کونسا فیصلہ کریں گے؟ اور کیا سوچیں گے؟ کیا سب نے ان کو دھوکہ دیا؟ بیٹا ان کا اپنا نہیں بن سکا تو کیا پوتا بھی ان کا نہیں بن پایا؟ ان کے پاس ساری زندگی کا سرمایہ، ساری زندگی کا کیا اثاثہ تھا؟ صرف اور صرف عارفین شیرازی اور زندگی کے ایک مقام پہ وہ بھی ان کو دھوکہ دے گیا تھا؟ اور یہی سب سوچ کر وہ اپنے آپ کو کچھ بھی کہنے سے روک لیتا تھا ابھی ابھی اس نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو روکا تھا اور بات ٹال دی تھی۔



وہ کمرے میں داخل ہوا ہی تھا کہ بی بی جان نے فوراً ہاتھ کے اشارے سے اسے کچھ بھی بولنے سے روک دیا تھا، گویا حانی ابھی ابھی سویا تھا، وہ ایک ہاتھ سے اسے تھپکتے ہوئے سلار ہی تھیں۔

”السلام علیکم!“ اس نے بے حد آہستگی سے قریب آ کر سلام کیا تھا۔

”وعلیکم السلام، بیٹھو بیٹا۔“ انہوں نے بھی آہستگی سے ہی جواب دیا تھا۔

”یہ ٹھیک تو ہے؟“ اس نے حانی کی سمت اشارہ کیا تھا۔

”ہاں اللہ کا شکر ہے ٹھیک ہے، یہ بس نیند کے لئے رو رہا تھا اسی لئے سلا یا ہے۔“ بی بی جان نے چھ ماہ کے حانی کو پیار بھری نظروں سے دیکھا، وہ نرم بستر پر نرم سی کروٹ لئے سو رہا تھا۔

”زونکہ کہاں ہے؟“ عارفین کو بیوی کا خیال آیا۔

”جہاں ہوتی ہے۔“ بی بی جان نے تلخی سے کہا تھا اور عارفین چپ سا ہو گیا تھا، وہ جن چیزوں، جن کاموں میں قصور وار نہیں بھی تھا ان کے لئے بھی مجرم ہو جاتا تھا۔

”اچھا بیٹا تم کپڑے تبدیل کر کے آؤ تب تک ہم کھانا لگواتے ہیں۔“ بی بی جان بیڈ سے اترتے ہوئے بولیں۔

”دودھ پیاتے ہیں؟“ عارفین نے بیڈ کے قریب آتے ہوئے پوچھا تھا۔

”ظاہر ہے بیٹا یہ دودھ پی کر ہی سویا ہے، دودھ کے بغیر گزارا ہے اس کا؟“ وہ خوشگوار لہجے میں بات کر کے عارفین کی فکر منار ہی تھیں۔ وہ بیڈ کے قریب کھڑا حافی کے چہرے کو بغور دیکھ رہا تھا، آنسوؤں کی نمی سے اس کی پلکیں جڑی ہوئی تھیں، وقفے وقفے سے اس کے منہ سے ہلکی ہلکی سسکیاں بھی نکل رہی تھیں، یعنی وہ کافی دیر تک اور کافی شدت سے روتا رہا تھا۔

”میں اس کو اپنے بیڈ روم میں لے جاتا ہوں۔“ وہ جھک کر اسے اٹھانے لگا تھا۔

”ارے..... رے جاگ جائے گا، اتنی مشکل سے سلا یا ہے ابھی..... پگلے اسے کوئی تنگ کر رہا ہے یہاں؟“ بی بی جان نے بڑی تیزی سے عارفین کا بازو پیچھے ہٹایا تھا۔

”دیکھو تھکے ہوئے آئے ہو، جا کر کپڑے تبدیل کرو اور کھانا کھاؤ آکر، میں بھی آ رہی ہوں۔“ وہ لہجہ بدل کر بولیں تو عارفین خاموشی سے پلٹ کر چلا گیا تھا اور تھوڑی دیر بعد وہ بی بی جان اور بابا جان کے ساتھ بیٹھا کھانا کھا رہا تھا، لیکن اس کا دھیان بار بار زونک کی طرف جارہا تھا جو حافی کی ذرا سی بھی پرواہ کئے بغیر اس وقت نہ جانے کہاں رنگ رلیاں منار ہی تھی؟ اور حافی تو دور کی بات اس نے اب عارفین کی تھوڑی بہت پرواہ کرنا بھی چھوڑ دی تھی، پہلے ساری زندگی اس نے ماں کی لاپرواہیاں دیکھی تھیں اور اب ماں کے ساتھ ساتھ بیوی کی عیاشیاں بھی دیکھنا پڑ رہی تھیں، قسمت کا چکر ہی کچھ ایسا تھا کہ وہ چاہ کر بھی ان سے دامن نہیں چھڑا پارہا تھا، کیونکہ ان سے دامن چھڑا لینا اتنا آسان ہوتا تو آج وہ اس نوبت کو نہ پہنچتا جہاں وہ سکون بھی گنوا بیٹھا تھا اور جہاں وہ بی بی جان، بابا جان کے ساتھ ساتھ اپنے ضمیر کا اور اپنے بیٹے کا بھی مجرم تھا۔



”تمہیں تنخواہ نہیں ملی ابھی تک؟ گھر کی ہر چیز ختم ہو چکی ہے، اتنی تنگی ہو رہی ہے آج کل۔“ اس کو آفس کے لئے تیار ہوتے دیکھ کر بھابی نے ذرا بے زاری سے کہا تھا، ارونی اپنے لمبے بالوں کی چوٹی بناتے بناتے لمحہ بھر کور کی اور بھابی کا کوفت زدہ چہرہ دیکھا تھا۔

”کیم آج ہے بھابی.....“ اس نے نپے تلے مگر کچھ خفگی بھرے انداز سے جواب دیا تھا۔

”اچھا؟ میں تو سمجھی تھی کہ کل کیم تھی، خیر واپسی پہ تنخواہ ملے تو میری یہ میڈیسن لے آنا، رات کو تھکن سے نیند نہیں آئی اور بی بی بھی ہائی ہو جاتا ہے۔“ انہوں نے جھٹ اپنی لسٹ تھما دی تھی اور ارونی اپنا بیگ اٹھا کر باہر نکل آئی تھی۔

”سو نیا تیار ہے؟“ اس نے پلٹ کر بھابی سے پوچھا تھا۔

”ہاں تیار ہے اس کی ٹیچر سے کہنا کل کسی بچے نے سونیا کو مارا تھا، اس کے گال پہ ابھی بھی نشان ہے یہ دیکھو۔“ بھابی نے سونیا کو پکڑ کر سامنے کیا تھا۔

”تو آپ نے مجھے کل کیوں نہیں بتایا تھا؟“ ارونی سونیا کو قریب سے دیکھ کر تڑپ گئی تھی اس کے گال پہ سرخ نشان بہت واضح دکھائی دے رہا تھا۔



”میں ابھی بات کرتی ہوں ٹیچر سے۔“ اروئی سونیا کی انگلی تھا مے دروازہ عبور کر گئی تھی۔

سونیا کا سکول ان کے محلے سے اتنا دور نہیں تھا، اروئی روزانہ آفس جاتے ہوئے سونیا کو سکول چھوڑتے ہوئے جاتی تھی اور واپسی پہ سارہ اس کو لے آتی تھی۔ پانچ سالہ سونیا جو ابھی پریپ میں اپنی زبان اپنے الفاظ کے اتار چڑھاؤ درست کر رہی تھی، سب گھر والوں کو ہی بہت پیاری لگتی تھی، اروئی اور سارہ بھی بے حد پیار کرتی تھیں اور پیار تو انہیں ایک سالہ عمر سے بھی تھا، وہ بھی اپنی تو قلی زبان سے پھوپھو کہہ کر دل موہ لیتا تھا اور وہ بہنیں نار ہو جاتی تھیں۔

سونیا کی ٹیچر سے بات کرتے کرتے وہ آفس سے لیٹ ہو چکی تھی، جیسی بہت عجلت میں وہ آفس پہنچی تھی اور سیڑھیاں چڑھتے ہوئے وہ بُری طرح کسی سے ٹکرائی تھی، لیکن ایک مضبوط ہاتھ نے جس مضبوطی سے اسے بازو سے پکڑ کر گرنے سے روکا تھا وہ اس گرفت اور اس ہاتھ کے مضبوط پس سے ہی پہچان گئی کہ اسے سہارا دینے والا کون ہے؟

”ایم سوری سرا!“ وہ فوراً سنبھل کر بولی تھی، جبکہ عارفین نے کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھی تھی۔

”کتنے منٹ لیٹ ہیں آپ؟“

”چالیس منٹ۔“ اس نے سر جھکا لیا تھا۔

”آفس کے رولز کے مطابق پندرہ منٹ لیٹ ہونے والے ورکر کو چھوٹ دی جاسکتی ہے اتنا زیادہ لیٹ ہونا قابل قبول نہیں ہو سکتا۔“ عارفین آفس ٹائمنگ کے متعلق اتنا سختی سے پیش آتا تھا کہ اس کا کوئی بھی ورکر کبھی لیٹ نہیں ہوتا تھا، کیونکہ وہ سب کے سامنے جھاڑ کے رکھ دیتا تھا، جیسے اس وقت اروئی کے ساتھ ہوا تھا۔

”ایم سوری سر مجھے اپنی بھتیجی کے ساتھ اس کے سکول جانا پڑ گیا تھا، اس لئے لیٹ ہو گئی تھی۔“ وہ اپنے سامنے کھڑے تفتیشی آفیسر کو سر جھکائے جواب دے رہی تھی۔

”کم از کم آپ کو مجھ سے پہلے آفس میں موجود ہونا چاہئے کیونکہ آپ میری پی اے ہیں، میں نہیں، اور یہی اس جاب کی ڈیمانڈ ہے انڈر سٹینڈ؟“

”یس سرا!“ اس نے آہستگی سے سر ہلایا تھا۔

”اوکے آپ اب جاسکتی ہیں۔“ وہ سیڑھیوں کی سمت اشارہ کرتے ہوئے راستے سے ہٹ گیا تھا اور وہ تیزی سے سیڑھیاں چڑھ گئی تھی۔

”ہیلو مس اروئی حیات! کیسی ہیں آپ؟“ ابھی وہ اپنی سیٹ پہ آ کر بیٹھی ہی تھی کہ کہیں سے احمر انصاری ٹپک پڑا تھا۔

”اللہ کا شکر ہے ٹھیک ہوں میں۔“ وہ انتہائی لاپرواہی سے کہتی اپنی ٹیبل کے دراز کا لاک کھول کر ضروری فائلز نکالنے لگی۔

”صبح صبح باس نے اچھا نہیں کیا، کم از کم آپ کو اندر تو آنے دیتے، وہیں سیڑھیوں پہ ہی کلاس لینا شروع کر دی۔“ احمر انصاری ہمدردی جتا رہا تھا۔ لیکن اروئی ایسی کسی بھی ہمدردی کو خاطر میں نہیں لاتی تھی، وہ ایک باشعور اور سمجھ دار لڑکی تھی، وہ ہمیشہ وہی کرتی تھی جو اس کے لئے فائدہ مند

ہوتا تھا، جو اس کے لئے نہ سہی، لیکن اس کے گھر والوں کے لئے اچھا ہوتا تھا۔ اور جو اس کے دل و دماغ کو مناسب لگتا تھا۔

”غلطی میری ہی تھی، میں لیٹ آئی تھی، حالانکہ مجھے آفس رولز کی خبر بھی تھی، پھر بھی یہ کوتاہی کر بیٹھی اور سر کا حق بنتا ہے کہ وہ اپنے ورکرز کی غلطی ان کی کوتاہی پہ انہیں ڈانٹ سکیں، کیونکہ وہ ہمیں ”اس وقت“ کا پیسہ دیتے ہیں، وقت کے زیاں پہ نقصان انہی کا ہوتا ہے ہمارا نہیں۔“ اروئی نے ایک مضبوط سی دلیل دے کر احمر انصاری کی بولتی بند کردی تھی جو اس آفس میں جاب کرنے کے لئے نہیں بلکہ اپنے شوق کی تکمیل کرنے کے لئے آتا تھا، وہ کافی اچھی فیملی سے تعلق رکھتا تھا اور عارفین شیرازی کے جاننے والوں میں سے تھا، انہی کی سفارش پہ اس نے اسے جاب دے رکھی تھی، ورنہ احمر انصاری کا ہونا نہ ہوتا برابر ہی تھا۔

”اوہ ایم سوری! میں بھول گیا تھا کہ آپ ایک سمجھ دار خاتون ہیں، آپ ہر ایک کا زاویہ نظر سمجھتی ہیں سوائے.....“ اس نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی، جس پہ اروئی نے سر اٹھا کر جن نظروں سے دیکھا تھا وہ گڑبڑا کر وہاں سے اٹھنے پہ مجبور ہو گیا تھا۔

”ویسے مس اروئی حیات انسان کو اتنا روڈ بھی نہیں ہونا چاہئے کہ وہ دو منٹ کسی سے بات بھی نہ کرے۔“ احمر انصاری کی بات پہ وہ کھول اٹھی تھی۔

”مسٹر احمر انصاری یہ وقت باتوں کا نہیں کام کا ہوتا ہے۔“

”میں جانتا ہوں اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ آپ کام کے علاوہ کچھ نہیں جانتیں، آپ کے پاس کام کے لئے وقت ہے، مگر اپنے آس پاس بکھرے انسانوں کے لئے ذرا سا بھی ٹائم نہیں۔“ احمر انصاری بے حد سنجیدہ لہجے میں بول رہا تھا۔

”میرے پاس اس لئے کسی اور کام کے لئے وقت نہیں ہوتا، کیونکہ میں آپ کی طرح شوقیہ جاب نہیں کرتی، یہ جاب، یہ کام میری ضرورت ہیں، مجھے تنخواہ ملتی ہے، وقت کی پابندی کرنا اور آفس کے رولز کے مطابق چلنا میری مجبوری ہے، کیونکہ میں اگر ٹھیک سے کام نہیں کروں گی تو مجھے تنخواہ نہیں ملے گی اور تنخواہ نہ ملی تو میری مجبوریاں حل نہیں ہوں گی، اس لئے میں چاہتی ہوں کہ کوئی بھی میری زندگی اور میری جاب ٹائمنگ میں مداخلت نہ کرے۔“ اروئی کا لہجہ بے انتہا سخت تھا، وہ حد سے زیادہ اموشل ہو گئی تھی، اسے بار بار لوگوں کا اس کی سٹی ہوئی ذات کو کریدنا اور بکھیرنا بہت بُرا لگتا تھا، وہ چڑ جاتی تھی، احمر انصاری پل بھر کے لئے کچھ کہہ ہی نہ سکا تھا، کیونکہ وہ سچ ہی تو کہہ رہی تھی، شوقیہ جاب کرنے اور مجبوری کے تحت کام کرنے میں بڑا فرق تھا۔ احمر انصاری کام نہ بھی کرتا تو اس کی صحت پہ کوئی اثر نہیں پڑ سکتا تھا، وہ جاب سے ہاتھ دھو کر بھی ریلیکس رہتا جبکہ اروئی جاب سے ہاتھ دھو بیٹھتی تو یقیناً اس کے گھر والوں کو قافے کرنا پڑ جاتے..... اسی لئے اس کام کی فکر اور وقت کی قدر کرنا پڑتی تھی۔

”ایم سوری مس اروئی، میں اس خیال سے ہرگز نہیں کہہ رہا تھا، بلکہ آپ کو سب سے الگ تھلگ دیکھتا ہوں تو دل میں بے اختیار یہ خواہش ابھرتی ہے کہ آپ بھی سب کے ساتھ نہیں بولیں، سب کے ساتھ مل کر بیٹھیں، انجوائے کریں اور یہ اداسی اور تنہائی کا حصار توڑ دیں۔“

”پلیز احمر صاحب میں اس وقت کسی بھی طویل بحث میں نہیں پڑنا چاہتی۔“ اس نے احمر انصاری کی بات درمیان میں ہی کاٹ کر اپنی بات واضح کی تھی، جس کو سمجھتے ہوئے وہ سر ہلا کر خاموشی سے پلٹ کر باہر نکل گیا تھا اور وہ کوئی بھی بات خود پہ طاری کئے بنا فوراً سر جھٹک کر اپنے کام میں لگ گئی



تھی۔ اور شام پانچ بجے آفس سے سیلری لے کر نکلی تو بھائی کی تھمائی ہوئی لسٹ دیکھی تھی جن پہ کچھ دوائیاں اور کچھ نائٹ کریز تھیں، جو وہ اپنے چہرے کو تروتازہ رکھنے کے لئے رات سونے سے پہلے استعمال کرتی تھیں۔ اس نے گھر کی سمت رخ کرنے کی بجائے مارکیٹ کی سمت رخ کیا تھا، بھائی کی مطلوبہ اشیاء لینے کے بعد بھائی کے لئے فروٹ لیا۔ جس بسکٹ اور چاکلیٹ سونیا کے لئے تھے، سارہ کی چپل نہیں تھی اس کے لئے چپل پسند کی اور بھائی کی پسندیدہ ڈش بنانے کے لئے قیمہ بھی بنوا لیا تھا، ذہن میں جو ضروری کام تھے وہ نپٹا لئے تھے، البتہ باقی رقم سے ابھی بجلی، گیس اور سونیا کی فیس کے بل بھی جمع کروانا تھے، انہی کا حساب کتاب کرتی سارا سامان اٹھائے وہ کسی ٹیکسی یا رکشا کے انتظار میں سڑک پہ آکھڑی ہوئی تھی۔

اس وقت شام کے چھ بج رہے تھے، شام کا سیاہ آنچل مزید سیاہ رنگ میں رنگتا جا رہا تھا اور سورج کا سنہری جسم افق کی گود میں چھپ کر گہری نیند لینے کا تمنائی ہو رہا تھا اور اس کی یہ تمناء حوال میں عجیب سی افسردگی کا رس گھول رہی تھی، ادا سی پوری فضا میں رچی تھی۔ لوگ پنچھیوں کی طرح اپنے اپنے آشیانوں کو لوٹ رہے تھے، سڑک کا کشادہ سینہ گاڑیوں کے ٹائروں سے دھڑک رہا تھا۔ ہر ایک کو سب سے پہلے آگے نکلنے کی اور اپنے گھر جانے کی جلدی تھی، گلی رنگین، شوخ مزاج رو میخک مرد جاتے جاتے سنگل کے قریب کھڑے بچے سے اپنی بیویوں کو خوش کرنے کے لئے پھولوں کے گجرے بھی لیتے جا رہے تھے اور وہ بچہ مسکراتے ہوئے خوشی خوشی پھول بیچ رہا تھا، صرف اس احساس سے کہ آج وہ بھی اچھی کمائی کر کے گھر جائے گا، اس کے گھر والوں کی ضرورت بھی پوری ہوگی اور اس پھول بیچنے والے بچے کی خوشی دیکھ کر روٹی کے دل میں اک گہری ہوک اٹھی تھی اور جسم کا رواں کھڑا ہو گیا تھا، صرف اتنی سی سوچ سے کہ ”گھر والوں کی ضرورت پوری کرنے کے لئے انسان اتنا مجبور ہو جاتا ہے کہ اپنا آپ بھی ”بیچ“ دیتا ہے، اپنا جسم، اپنے احساسات اور اپنے جذبات بھی پیسوں میں تول دیتا ہے، کبھی کبھی اپنی خواہشوں کو پورا کرنے کے لیے اور کبھی کبھی گھر والوں کی ضرورت پوری کرنے کے لئے..... اور وہ بچہ تو محض پھول ہی بیچ رہا تھا۔“ روٹی اس بات کو سوچتے ہوئے کانپ اٹھی تھی، اس کے ماتھے پہ پسینے کے قطرے نمودار ہو گئے تھے، دل بے انتہا گھبراہٹا تھا اور اپنی غیر ہوتی حالت کو سنبھالتی وہ قریب رکنے والی گاڑی سے اچانک ڈر کے پیچھے ہٹی تھی۔

”آؤ میں ڈراپ کر دیتا ہوں..... کافی دیر ہو چکی ہے۔“ عارفین کی بھاری آواز کافی قریب سے ابھری تھی، وہ اپنی سوچ اور موجودہ ماحول سے چونک کر اس کی سمت متوجہ ہوئی تھی، وہ گاڑی کا شیشہ فولڈ کر رہا تھا۔

”تو ٹھیکس سر میں چلی جاؤں گی۔“ اس نے بیگ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کرتے ہوئے سختی سے انکار کر دیا تھا۔

”نائم بہت ہو چکا ہے اور اس اسٹاپ پر رش بھی بہت ہے، تمہیں دیر ہو جائے گی۔“ عارفین نے اصرار کیا تھا، وہ چند لمحے ہی سہی اسے اپنے پاس اپنے قریب دیکھنا چاہتا تھا۔

”ایم سوری سر، میں عارضی سہارے نہیں اپنانا چاہتی، اللہ حافظ.....“ وہ کہہ کر اس طرف بڑھ گئی جس طرف سے مخصوص ہارن دیتی لوگوں سے کچھ کھینچ بھری بس آرہی تھی اور پھر عارفین کے دیکھتے ہی دیکھتے وہ اس پر بھوم بس اور دھکم پیل میں سوار ہو گئی تھی، عارفین کا خون غصے اور اذیت کے احساس سے جل کر سیاہ ہو گیا تھا، اس نے تلملا کر اسٹیرنگ پہمکا دے مارا تھا۔

”میرے ساتھ ہی ایسا کیوں ہوا؟ سب آزاد ہو گئے اور..... میں..... میں قید میں آ گیا؟“ بے بسی نے جیسے اس کے غصے، اس کی سوچ کو مفلوج

کر ڈالا تھا۔ گھر آ کر ہمیشہ کی طرح وہ تھکے تھکے سے انداز میں صوفے پر پڑے گیا تھا، لیکن اس سے پہلے کہ وہ اس اذیت، اس بے بسی کو دل کی دیواروں پہ نقش ہوتا محسوس کرتا چاٹک قریب ہی سے حانی کے رونے کی آواز سنائی دی تھی اور وہ ساری جھکن اور ساری کوفت بھلا کر فوراً سیدھا ہوا تھا۔

”ارے..... نئی..... نئی یا رونا نئی..... شاباش نئی رونا۔“ اس نے فوراً کاٹ میں سوئے حانی کو اٹھایا تھا، وہ بیدار ہونے کے بعد رونے کا اشارت لے چکا تھا اور اسے چپ کروانا بے حد مشکل کام تھا، مگر آج وہ باپ کی صورت دیکھ کر خود بخود ہی خاموش ہو گیا تھا، چھ ماہ کا حانی عارفین شیرازی کے شب و روز کا مرکز تھا، وہ اپنے بیٹے کی ذرا سی تکلیف پہ تڑپ اٹھتا تھا، خود جھکن ہونے کے باوجود وہ اس کی ہر چیز کا دھیان رکھتا تھا، اس کی بھرپور نیند اس کے صاف ستھرے کپڑے اس کے فیڈر اور نیل کی صفائی، اس کے عکس ز اور پیٹی..... وغیرہ بھی وہ ملازمہ سے پوری توجہ سے کرواتا تھا، تاکہ وہ کسی بھی چیز سے ڈسٹرب نہ ہو..... کبھی جو حانی آفس سے واپسی پہ روتا ہوا ملتا تو پھر عارفین کا سارا غصہ زونکہ پہ ہوتا تھا یا پھر اپنی ماں رابعہ شیرازی..... مگر زونکہ کو رابعہ شیرازی کی..... سپورٹ حاصل تھی، اسی لئے وہ عارفین کے غصے کو کافی لائٹ لیتی تھی، اسے حانی کی بالکل پرواہ نہیں تھی، البتہ کبھی کبھار اگر وہ موڈ میں ہوتی تو خوب پیار محبت کا منظر دیکھنے کو ملتا تھا۔ آج تک حانی کو باپ کی محبت ہی میسر آئی تھی، وہ چھ ماہ کا معصوم بچہ ماں کے ہوتے ہوئے بھی ماں کے وجود اور ماں کی محبت سے محروم تھا۔ اور اسی چیز پہ عارفین کا خون پہروں جلتا تھا اور اپنی بے بسی پہ وہ اکثر بھڑک جاتا تھا، مگر ماں کے ساتھ بد مزگی پیدا کرنا بھی اسے اچھا نہیں لگتا تھا۔ وہ کئی بار اپنے آپ کو انتہائی قدم اٹھانے سے روک لیتا تھا، حانی کی پیدائش سے پہلے وہ اتنا بے بس نہیں تھا جتنا اب ہو گیا تھا اور نہ ہی اسے اس طرح جلنے کڑھنے کی عادت تھی، جیسے اب ہو چکی تھی..... لیکن پھر بھی گزارا تو کرنا ہی تھا۔

”عذرا حانی کا فیڈر لے کر آؤ اسے بھوک لگی ہے۔“ عارفین نے ملازمہ کو آواز دی تھی، آج بی بی جان واپس گاؤں جا چکی تھیں اور بابا جان بھی ان کے ساتھ ہی گئے تھے، لیکن ان کی آمد اکثر و بیشتر ہوتی رہتی تھی، پہلے بی بی جان صرف ڈاکٹر سے چیک اپ کے لئے شہر آتی تھیں، لیکن اب وہ حانی سے ملنے کے لئے بھی آ جاتی تھیں۔

”زونکہ کہاں ہے؟“ عذرا سے حانی کا فیڈر لے کر وہ اپنی بیگم کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔

”جی وہ اوپر بیڈروم میں آرام کر رہی ہیں۔“ عذرا نے آہستگی سے بتایا تھا۔

”اس وقت وہ گھر پہ ہے؟“ اسے حیرت ہوئی تھی۔

”جی رات کو انہوں نے بوی بیگم صاحبہ کے ساتھ کسی شو میں شرکت کے لئے جانا ہے اس لئے آرام کر رہی ہیں۔“ عذرا نے اس کے آرام کا جواز بھی بیان کر دیا تھا اور وہ سر ہلا کر رہ گیا تھا، گویا اس وقت اس گھر کی بیگمات گھر پہ ہی تھیں..... وہ تھوڑی دیر بعد حانی کو ساتھ لئے اپنے بیڈروم میں آ گیا تھا۔ جہاں زونکہ اپنے آرام دہ ٹائٹ ڈریس میں ملبوس ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی اپنے ہاتھوں پہ کلیزنگ ملک سے مساج کرتی نظر آتی تھی۔

”ہائے عارفین! آپ کب آئے آفس سے؟“ زونکہ اسے دیکھ کر دور سے ہی ہاتھ ہلا کر چمکی تھی۔

”تم میرے آنے جانے کی ٹائمنگ سے اچھی طرح واقف ہو۔“ عارفین کا لہجہ سرد تھا۔

”کبھی کبھی نبجانے کیوں“ آپ لیٹ بھی ہو جاتے ہیں۔ اس لئے پوچھ رہی تھی۔“ زونکہ کا لہجہ البتہ بہت سے معنی لئے ہوئے تھا، عارفین



کے وجود میں غصے کی ایک تیز لہر اُٹدی تھی، لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتا دروازے پہ دستک دے کر رابعہ شیرازی اندر داخل ہوئی تھیں۔

”زونکہ بیٹا تم کتنے بچے گھر سے نکل رہی ہو؟“ وہ زونکہ کی طرف متوجہ تھیں، عارفین حانی کو بیڈ پہ لٹا کر اپنے بولوں کے تسے کھولنے لگا تھا۔

”ٹھیک آٹھ بجے نکلوں گی ہال میں پہنچتے ہوئے نو، ساڑھے نو بج جائیں گے اور شודس بجے شروع ہوگا۔“ وہ دونوں آپس میں ٹائم مقرر کر

رہی تھیں اور عارفین ان کو انگور کئے اپنے کام میں لگا ہوا تھا۔

”اوکے ٹھیک ہے پھر میں بھی تب تک تیار ہو جاتی ہوں۔“ وہ کہتے ہوئے مڑیں اور عارفین کو حانی کی طرف متوجہ دیکھ کر ٹھہر گئی تھیں۔

”بہت پیار ہے تمہیں اپنے بیٹے سے؟“ ان کا انداز استہزائیہ تھا، وہ ضبط کر گیا تھا۔

”اولاد جانوروں کو بھی بہت پیاری ہوتی ہے ماما جان میں تو پھر ایک انسان ہوں۔“ اس نے پلٹ کر اپنی ماں کو دیکھا، وہ اس کی آنکھوں

میں ہلکورے لیتا طنز یا آسانی دیکھ چکی تھیں۔

”لیکن حد سے زیادہ پیار ہمیشہ بگاڑ پیدا کرتا ہے، چاہے کسی سے بھی ہو.....“ انہوں نے اپنی بے کاری منطق پیش کی تھی۔

”اگرچہ ماہ کا بچہ میرے پیار سے بگڑ سکتا ہے تو مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا، بلکہ میرے پیار سے اس کا بگڑ جانا بھی میرے لئے خوشی کا باعث

ہوگا، میں اپنے بیٹے کو اپنے باپ سے محروم نہیں کر سکتا۔“

”اونہہ! یہ وہی بچہ ہے عارفین جس کے پیدا ہونے پہ تمہیں اختلاف تھا، تم کو اس کے ذکر پہ بھی اعتراض ہوتا تھا، تم انکاری تھے اس سے،

لیکن مجھے سمجھ نہیں آتا کہ اب..... اب اتنی جان کیوں چھڑکتے ہو؟ کیا وجہ ہے اتنے پیاری؟“ انہوں نے جواباً طنز آزمایا تھا۔

”اختلاف مجھے اس کے وجود سے نہیں آپ کے کروتوت.....“ وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا تھا، اس کی آنکھیں غصے سے سرخ ہو رہی تھیں اور

لب سختی سے بھیج رکھے تھے۔

”اوہ کم آن مام! آپ پلیز کن باتوں میں پڑ گئی ہیں، جلدی سے تیار ہو جائیں میں ابھی آرہی ہوں۔“ زونکہ نے ماں، بیٹے کے سچ آکر

بات کو سنبھالنے کی کوشش کی تھی۔ رابعہ شیرازی عارفین کی ادھوری بات کا زہر پیتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی تھیں، اس وقت سچ سچ ان کے پاس

جھگڑا فساد کرنے کا ٹائم نہیں تھا۔

”کیا ہو گیا ہے آپ کو؟ آپ بھی ہر بات پہ غصہ کرنے لگے ہیں آج کل، پلیز کول ڈاؤن.....“ زونکہ نے عارفین کا بازو پکڑ کر اسے بیڈ پہ

بٹھایا تھا۔ اور عارفین نے نفرت سے زونکہ کو دیکھتے ہوئے اس کے ہاتھ سے اپنا بازو چھڑایا تھا۔

”بات انہوں نے شروع کی تھی میں نے نہیں۔“ وہ غضب ناک ہوا تھا۔

”تو اس میں اتنا غصہ کرنے والی کون سی بات ہے، وہ ماما ہیں ہماری، کیا وہ ہم سے کچھ بھی نہیں کہہ سکتیں؟“ زونکہ کو رابعہ شیرازی سے محبت

کا اُبال اٹھا تھا۔

”ہرگز نہیں! وہ مجھ سے کچھ کہنے کا حق نہیں رکھتیں، انہوں نے میرے ساتھ میرے جذبات کے ساتھ جو کھیل کھلایا ہے اس کے بعد کچھ بھی

کہنے سننے کی گنجائش نہیں نکلتی، میں جو کچھ ان کے لئے کر چکا ہوں وہی بہت ہے، مزید کوئی بھی پیار محبت نہیں جتا سکتا ان سے، وہ ماں نہیں ایک مفاد پرست عورت ہیں، انہوں نے ہمیشہ میری ذات کو کیش کیا ہے، بلکہ انہوں نے تو میری اولاد کو بھی نہیں بخشا۔“ وہ اس وقت خاصا زہر خندہ ہو رہا تھا، زونکہ نے کچھ کہنا چاہا تھا، مگر پھر خاموش ہو کر اپنا دامن بچا لیا تھا، وہ مزید کچھ کہہ کر اس کے غصے کو ہوا نہیں دے سکتی تھی، ناٹم کافی کم تھا اس کے پاس اور ابھی اس نے تیار بھی ہونا تھا، وہ چپکے سے اٹھ کر واش روم میں گھس گئی تھی۔



”اب کیسی طبیعت ہے آپ کی؟“ مغرب کی نماز ادا کر کے وہ کمرے سے باہر نکلی تو بہروز بھائی کو صحن میں بیٹھے دیکھ کر قریب آ گئی تھی۔  
 ”اللہ کا شکر ہے بیٹا بہت بہتر ہوں، تم سناؤ کام زیادہ تو نہیں ہوتا؟“ وہ بہت ہی پُر شفقت سے لہجے میں پوچھتے ہوئے اس کے سر پہ ہاتھ رکھ چکے تھے۔

”نہیں کام تو روزانہ ہی معمول کے مطابق ہوتا ہے اور ویسے بھی اتنے سے کام سے بھلا تھکن کیسی؟“ ارونی ان کی تسلی کے لئے مسکرائی تھی، کیونکہ اسے پتہ تھا کہ وہ اکثر اس کے بارے میں ہی سوچتے رہتے ہیں، انہیں یہی فکر ہوتی تھی کہ وہ اکیلی نازک سی لڑکی اس گھر کا بوجھ اٹھاتے اٹھاتے تھک جائے گی، آج کل کے مہنگائی کے دور میں مرد گھروں کا بوجھ اٹھاتے ہوئے ہار جاتے تھے، وہ تو پھر نازک اندام لڑکی تھی، جس کا جسم بھی نازک تھا اور جذبات بھی نازک تھے، بس حوصلہ اور ہمت مضبوط تھی۔

”بیٹا تھکن بھی ہو ہی جاتی ہے، تمہاری جو عمر سہیلیوں کے ساتھ ہنسی مذاق اور خوشگوار خواب دیکھنے کی تھی وہ تم نے میری بیماری کا علاج کرنے اور گھر کا بوجھ اٹھانے میں لگا رکھی ہے، اپنا آپ بھلا کر سب کا خیال رکھتی ہو یہ صرف تمہارا حوصلہ اور ہمت ہے، ورنہ ایسا کرنا اتنا آسان نہیں ہے۔ میں جب کام کرتا تھا تو واپسی پر اتنا تھک جاتا تھا کہ تم لوگوں کے ساتھ کچھ دیر بیٹھ کر ٹھیک سے بات بھی نہیں کر پاتا تھا، بس یہی کوشش ہوتی تھی کہ تھوڑا آرام کر لوں..... مگر تمہیں میں نے آج تک ایسا کرتے نہیں دیکھا، تم سب کو ان کے حصے کا ناٹم دیتی ہو، چاہے وہ سونیا اور عمر ہو، چاہے امی جان یا پھر میں خود.....“ وہ آج کافی باریک بینی سے ارونی کی خوبیاں جانچ رہے تھے، ارونی کا سر جھک گیا تھا۔

”بھائی میں دراصل یہ چاہتی ہوں کہ گھر میں کوئی یہ محسوس نہ کرے کہ آپ بیمار ہیں، میں سب کو یہ احساس دلانا چاہتی ہوں کہ آپ بالکل ٹھیک ہیں، آپ کی موجودگی، آپ کی صحت، آپ کی تسلی میرے لئے بہت اہم ہیں۔“ وہ ان کا ہاتھ تھامتے ہوئے کچھ روہانسی ہو گئی تھی۔  
 ”بیٹا میں مر بھی جاؤں تو تمہارا یہ احسان نہیں اتار سکتا۔“ وہ مشکور ہونے لگے تھے۔

”بھائی پلیز! آپ ایسا کہہ کر مجھے میری ہی نظروں میں بے قدر اور بے وقعت کیوں کر رہے ہیں؟ اگر آپ کی نظروں میں میری کوئی اہمیت ہے تو اسے احسان کے لفظ استعمال کر کے ختم نہ کیا کریں۔ اور میں نے کوئی پہاڑ نہیں کھودا، جس پہ آپ ہمیشہ شکریہ ادا کر کے مجھے شرمندہ کر دیتے ہیں اور ویسے بھی یہ گھر جتنا آپ کا ہے اتنا میرا بھی ہے، میرا اتنا ہی حق بنتا ہے جتنا آپ کا تھا۔“ ارونی نے ان کے ہاتھوں پہ ہاتھ رکھے ہوئے تھے اور انہیں بھرپور تسلی دے رہی تھی۔



”بے شک ہزاروں لڑکیاں ہیں، مگر بیٹا میرے لئے تم تو اکیلی ہی ہو نا، جس نے میرے لئے اتنی جدوجہد کی ہے، اتنی قربانی دی ہے۔“

”قربانی؟“ اروی نے بڑی طرح چونک کر بہروز بھائی کو دیکھا تھا، ان کے چہرے پہ اروی کے لئے محبت ہی محبت تھی اور ایسا کوئی تاثر نہیں تھا جس سے وہ لفظ ”قربانی“ کا مطلب اخذ کرتی۔

”اپنی آنکھوں کی نیندیں، اپنے خواب، اپنا آرام، اپنا سکھ چین اپنے آپ کی پرواہ، سب کچھ چھوڑ دینا، وہ بھی کسی اپنے کی خاطر.....

قربانی ہی تو ہے بیٹا؟ اور اس سے بڑی قربانی کیا ہوگی بھلا؟“ بہروز بھائی بہت پشمرہ ہو رہے تھے۔ ”آپ کو کیا پتہ بھائی میں نے قربانی کی کون سی حد پار کی ہے؟ میں نے کسی قیامت کی قربانی دی ہے، آپ کو کیا خبر؟“ یہ سوچ، یہ احساس ذہن میں آتے ہی اروی کی آنکھوں میں دھندلا تر آتی تھی اور دل بیٹھے بیٹھے جتنی ریت پہ جاگرا تھا، خون کی جگہ رگوں میں اذیت پہننے لگی تھی، اس سے اب وہاں بیٹھنا دشوار ہو گیا تھا۔

”سارہ ادھر آؤ بھائی کے پاس بیٹھو، میرا شاید فون بج رہا ہے۔“ اروی فوراً وہاں سے اٹھ گئی تھی، اس کے دل میں ہوک اٹھ رہی تھی، دل بڑی طرح تڑپ رہا تھا۔

”آپ کو کیا خبر میرے بھائی، میں آپ کی زندگی کے عوض اپنی روح، اپنا جسم تک بیچ چکی ہوں، زندہ لاش کا چلتا پھرتا ثبوت ہوں میں، میرا سیزہ بغیر دل کے دھڑک رہا ہے، میری سانسیں بغیر آکسیجن کے چل رہی ہیں، میری آنکھوں کا نور بک چکا ہے..... اور..... اور میں پھر بھی زندہ لوگوں میں شمار ہوتی ہوں، پھر بھی میں جی رہی ہوں، میری ذات نہ جانے کس موڑ پہ کھو گئی ہے، مجھ سے میرا اپنا آپ بہت پیچھے رہ گیا ہے۔“ وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپائے پھوٹ پھوٹ کے رو پڑی تھی۔ اس کے اندر کچھ تڑپ رہا تھا، کچھ جل رہا تھا، پیاسے صحراؤں کی تشنگی اس کی ذات کے آگن میں بکھر چکی تھی، وہ اپنی تڑپ، اپنی جلن، اپنی تشنہ لبی کا اظہار کرنے سے قاصر تھی، بے بس تھی، اپنا دکھوں سے تار تار آچل کسی کو نہیں دکھا سکتی تھی، کسی کے سامنے اپنی قسمت کا رونا نہیں رو سکتی تھی، وہ ایسی اذیت کے جال میں جکڑی تھی جہاں سے رہائی کا کوئی امکان ہی نہیں تھا اور وہ اس جال میں تنہا بے بسی سے پھڑ پھڑاتی رہ جاتی تھی، سب سے چھپ کر روتی تھی اور ساتھ یہ بھی کوشش کرتی تھی کہ کوئی بھی اس کے آنسو نہ دیکھ پائے..... اگر کوئی ہمدردی سے رونے کی وجہ پوچھ لیتا تو یقیناً وہ خود پہ ضبط کا پہرہ نہیں بٹھا سکتی تھی..... اب بھی وہ اکیلی رو رہی تھی اور بے تحاشا رو رہی تھی۔

حانی کے لئے خشک دودھ کے ڈبے ”عمیرز، نئے فیڈر، نئے کپڑے، نشوز کے بندل اور بچوں کی ضرورت کی اور بھی دیگر اشیاء وغیرہ لے کر وہ سٹور سے نکل کر اپنی گاڑی کی سمت بڑھ رہا تھا، جب قدم ٹھٹک کے رہ گئے تھے۔ کائن کے سادہ سے لائٹ پینک کمر کے سوٹ میں ملبوس اپنے دھیان میں وہ کسی کا بازو تھامے برابر والے ہسپتال سے نکل رہی تھی..... اس نے ذرا غور سے پہچاننے کی کوشش کی تو فوراً جان لیا کہ وہ کون ہیں؟

”السلام علیکم!“ اس نے قریب جا کر سلام کیا تھا اور اس کی آواز پہ اروی کے قدم ٹھٹک گئے تھے۔ عارفین شیرازی اس کے روبرو کھڑا تھا، لیکن سلام وہ اس کی امی کو کر رہا تھا۔

”ارے شیرازی صاحب کیسے ہیں آپ؟“ اروی کی امی بھی اسے پہچان گئی تھیں، سلام کا جواب دینے کے بعد اس کا حال احوال پوچھنے لگیں۔

”اتنی اپنائیت بھی دے رہی ہیں اور ساتھ ایک فاصلہ بھی رکھ رہی ہیں، میں کیا سمجھوں اس کو؟“ عارفین نے اچھتی نظر سے اروئی کے چہرے پہ پھیلی ناگواری پل میں بھانپ لی تھی۔

”آپ کا کیا مطلب ہے بیٹا؟“ امی نے ناجحی سے استفسار کیا تھا۔

”میرا مطلب بہت واضح ہے، آپ پہلے بھی ایک ملاقات میں مجھے بیٹا کہہ چکی ہیں، اب بھی بیٹا کہہ رہی ہیں، جبکہ جہاں تک میرا خیال ہے کہ ماؤں کے لئے بیٹے ”آپ“ نہیں ہوا کرتے اور نہ ہی ماں ”شیرازی صاحب“ کہہ کر بلاتی ہیں ماؤں کے لئے بیٹے صرف بیٹے ہوتے ہیں۔“ عارفین کی وضاحت پر اروئی کی امی حیرت اور خوشی کی ملی جلی کیفیت سے اسے دیکھ رہی تھیں، لیکن اروئی کی پیشانی پہ شکنوں کا اضافہ ہو گیا تھا، اسے عارفین شیرازی کا یہ لگاؤ، یہ انسیت بالکل اچھے نہیں لگ رہے تھے، اسے کوفت ہونے لگی تھی۔

”امی چلیں؟“ اس نے اپنے آپ کو نارمل کرتے ہوئے پوچھا تھا۔

”آئیے میں آپ کو ڈراپ کر دیتا ہوں؟“ عارفین نے امی کو پیشکش کی۔

”نہیں ہم چلے جائیں گے، آپ پریشان نہ ہوں۔“ اروئی نے اسے انکار کر دیا تھا، حالانکہ وہ امی کو مخاطب کر رہا تھا۔

”اس میں پریشانی والی کوئی بات ہے؟ ماں جی آپ ٹھہریں، میں گاڑی نکالتا ہوں۔“ عارفین ان کو مزید انکار کا موقع دیئے بنا فوراً پلٹ گیا تھا، لیکن امی اور اروئی کی نگاہیں بیک وقت عارفین کے ہاتھوں میں پکڑے..... بیک سے نکرائیں، جن میں بچکانہ استعمال اور ضروریات کی چیزیں تھیں جن کے بارے میں امی نے گاڑی میں بیٹھتے ہی استفسار کر دیا تھا۔

”یہ چیزیں کس کے لئے ہیں بیٹا؟ کہیں چوری چھپے باپ تو نہیں بن بیٹھے اور ہمیں بتایا بھی نہیں؟“ ان کا سوال اروئی کے دل پہ اور عارفین کے اعصاب پہ اک برجھی سی چلا گیا تھا، وہ ان کو جواب دینے کے لئے الفاظ تلاش رہا گیا تھا۔ درحقیقت وہ اروئی کے سامنے اس سوال کا جواب دینے کی ہمت اپنے اندر..... مجتمع نہیں کر پا رہا تھا۔

”ارے بیٹا کہاں کھو گئے ہو؟“

”جی کہیں نہیں! آپ کو شاید پتہ نہیں چلا چھ ماہ پہلے ہمیں اللہ تعالیٰ نے بیٹا دیا تھا، اب تو ماشاء اللہ سات ماہ کا ہونے والا ہے، اس کی شاپنگ اور ضروریات کی چند چیزیں لینے کے لئے آیا ہوا تھا، ہر سٹورے کو اسی کے ساتھ بڑی رہتا ہوں۔“ عارفین نے بہت ہمت کر کے کہہ دی ڈالاکھا اور کھڑکی سے باہر دیکھتی اروئی کے چہرے پہ گہرے کرب کا سایہ لہرا کے گزر گیا تھا جو امی سے تو پوشیدہ ہی رہا، مگر بیک ویو مرر سے دیکھتے عارفین سے مخفی نہیں رہ سکا تھا۔

”اچھا بیٹا یہ تو اللہ نے بڑا ہی کرم کیا ہے آپ لوگوں پہ، میری طرف سے بہت بہت مبارک ہو آپ سب کو، مجھے تو سچ سچ پتہ ہی نہیں چلا اور اس پگلی اروئی نے بھی نہیں بتایا ورنہ میں مٹھائی لے کر ضرور آتی، آپ لوگوں کے بہت احسان ہیں ہم پہ، خاص طور پر زونکہ بی بی کے اور رابعہ بہن کے۔“ امی اور عارفین کی باتیں اروئی کو بے حد ناگوار گزر رہی تھیں اور پھر عارفین موضوع گفتگو بدلنے کی خاطر امی کی طبیعت اور بہروز بھائی کی صحت



کے متعلق باتیں کرنے لگا تھا، اپنے گھر کے قریب آکر گاڑی سے اترتے ہوئے اروئی نے گہری نظروں سے عارفین شیرازی کے ”بیٹے“ کے شاہجگدیز دیکھے تھے، اس کی نظروں کا زخمی پن وہ با آسانی محسوس کر چکا تھا، جیسی اللہ حافظ کہتے ہی فوراً گاڑی ریورس کر کے پلٹ کے چلا گیا تھا۔



آفس سے واپسی پہ گھر میں قدم رکھا تو خلاف معمول خاصی چہل پہل کا احساس ہوا تھا اور پھر برآمدے میں کھیلنے سونیا اور گنڈو کو دیکھ کر اس چہل پہل کی وجہ بھی سمجھ میں آگئی تھی، یعنی یسری آپنی تشریف لائی ہوئی تھیں۔ اروئی اپنے اور سارہ کے مشترکہ کمرے میں گئی۔ بیک رکھا، چادر اتار کر دوپٹہ اوڑھا اور پھر سادہ چہل پہنتی ہوئی بہروز بھائی کے کمرے میں آگئی جہاں یسری آپنی اپنے دو بچوں کے ساتھ موجود تھیں، ان کا تیسرا بچہ گنڈو باہر کھیل رہا تھا۔

”السلام علیکم آپنی، کیسی ہیں؟“ اروئی بہت عرصہ بعد بہن سے مل رہی تھی۔  
 ”میں ٹھیک ہوں، اللہ کا شکر ہے، تم سناؤ گریا کیسی ہو؟“ یسری آپنی اٹھ کر اروئی سے گلے ملی تھیں۔  
 ”میں بھی ٹھیک ہوں، عظیم بھائی کہاں ہیں؟ وہ کیوں نہیں آئے؟“ وہ یسری کے شوہر کا پوچھ رہی تھی۔ ”وہی چھوڑنے آئے تھے دوپہر کا کھانا بھی یہیں کھا کر گئے ہیں۔ تمہارا بھی پوچھ رہے تھے امی سے۔“ یسری نے مسکرا کر بتایا تھا۔  
 ”لیکن اتنی جلدی چلے کیوں گئے وہ بھی آج رات رک جاتے؟“

”انہوں نے کسی ضروری کام سے لاہور جانا تھا، اس لئے جلدی چلے گئے، پرسوں آجائیں گے، تم سناؤ بہت کمزور اور تھکی ہوئی لگ رہی ہو؟“ یسری آپنی نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے بہت محبت سے پوچھا تھا..... اروئی بے ساختہ چپ سی ہوگئی تھی کہ میرے چہرے، میرے وجود پہ نہ جانے کیسی تھکن ہے جو ہر ایک کو پہلی نظر میں ہی نظر آ جاتی ہے اور وہ اس تھکن کو باوجود کوشش کے چھپا نہیں پا رہی اور نہ ہی لفظوں میں بیان کر پا رہی ہو..... جامد چپ اور گہری تنہائی کے عالم میں وہ اپنی ہی ذات کی غلام گردشوں میں چکرا رہی تھی جہاں سے اس کا ہاتھ تھام کر اسے اس کیفیت سے نکالنے والا کوئی بھی نہیں تھا۔

عشاء کی نماز کے بعد وہ اپنے بستر پہ لیٹی ہی تھی کہ وہ بھی اس کے پاس ہی آ بیٹھیں۔ سارہ اپنے نوٹس وغیرہ بنانے میں مصروف تھی اور امی بھائی اور بھابی کے کمرے میں بیٹھی ہوئی تھیں، ان کی یہ روٹین تب سے چلی آ رہی تھی جب سے بہروز بھائی بیمار ہوئے تھے، وہ رات کو کچھ دیر ان کے پاس ضرور بیٹھتی تھی۔

”اروئی تم جانتی ہو مجھے آج بہروز بھائی نے بلایا ہے؟“ انہوں نے ہلکی سی تمہید باندھی۔  
 ”کیوں خیریت ہے؟“ اروئی کو پریشانی ہوئی تھی۔

”ہاں خیریت ہی ہے..... دراصل وہ چاہتے ہیں کہ تم اب اپنے گھر کی ہو جاؤ، کیونکہ شادی کے لئے یہی عمر موزوں ہوتی ہے۔“ یسری آپنی نے اس کے استفسار پہ مزید کوئی تمہید باندھے بغیر سیدھی سیدھی بات کہہ ڈالی تھی، اور ان کی بات پہ اروئی ایک دم سناٹے میں آگئی تھی، اس کے کانوں میں

سائیں سائیں ہونے لگی تھی، دل و دماغ یک دم منہ کے بل گرے تھے اور رگوں میں دوڑتے لہو کی رفتار ایک جھٹکے سے رکی اور نبض بے دم ہو کر رہ گئی۔  
 ”شادی؟“ وہ زیر لب بڑبڑاتی تھی یہ لفظ اسے کچھ کی طرح زہریلا لگا تھا۔

”ہاں بہروز بھائی کہتے ہیں کہ اب وہ پہلے سے بہتر ہیں اور ایک دو لوگوں کو کام کے لئے بھی کہہ چکے ہیں، یقیناً ان کو کام مل جائے گا تب تک تمہاری بات طے ہو جائے گی اور بعد میں شادی کی تیاری شروع کر لیں گے؟“

”لیکن آپ! ابھی تو وہ پوری طرح سے ٹھیک بھی نہیں ہوئے، وہ اتنی جلدی کام کیسے کر سکتے ہیں؟ اور ویسے بھی جب اتنا مشکل زمانہ ہم گزار چکے ہیں، تھوڑا وقت اور سہی، یقیناً اللہ بہتر حل نکالے گا۔ اتنا عرصہ علاج کروانے اور احتیاط کرنے کے بعد اب ہم اینڈ میں آ کر ایسی جلد بازی کیوں کریں؟ ہماری زندگی کے سب کاموں سے زیادہ بھائی کی زندگی اور صحت ہمارے لئے بہت زیادہ اہم اور ضروری ہیں یسری آپ!۔“ ارونی بات کرتے ہوئے بمشکل اپنے اعصاب کنٹرول کر پاتی تھی، ورنہ دل و دماغ کی سنگت بہت بے ربط ہو رہی تھی۔

”تمہاری پریشانی بھی بالکل بجا ہے ارونی، لیکن بہروز بھائی اپنی جگہ بالکل ٹھیک سوچ رہے ہیں، آج کل کے دور میں اچھے پروپوزل کب ملتے ہیں اور ویسے بھی جرات ہمیں پسند کرتا ہے۔“  
 ”کیا؟“ جرات کا نام سن کر وہ حیرت سے ہونچکا رہ گئی تھی۔

”ہاں یہ پروپوزل جرات اور بھائی کی مرضی سے آیا ہے، وہ بھی چاہتی ہیں کہ تم جرات کی دلہن بنو، اور کسی نہ کسی حد تک امی اور بہروز بھائی بھی اس رشتے پہ خوش ہیں، لیکن اس کے باوجود فیصلے کا اختیار تمہارے ہاتھ میں ہے، وہ تمہاری مرضی کے خلاف کچھ بھی نہیں کرنا چاہتے، مگر پھر بھی میں چاہوں گی کہ تم اس سچ پر سوچتے ہوئے سمجھداری سے کام لو، کیونکہ آج جو اچھے پروپوزل تمہارے نہ چاہنے کے باوجود آرہے ہیں، کل کو وقت ہاتھوں سے پھسل گیا تو یہی پروپوزل تمہارے چاہنے پر بھی نہیں آئیں گے.....“ یسری آپنی اپنے بڑے پن کا پورا پورا ثبوت دے رہی تھیں اور وہ زندگی کے ”بے بس مقام“ پہ کھڑی اپنے دماغ کو ماؤف ہوتا محسوس کر رہی تھی۔ یسری آپنی فیصلے کی ڈور اس کے ہاتھ میں تھا کہ جا چکی تھیں..... اور وہ اک نئے امتحان کے لئے اپنی ہمتیں مجتمع کرنے لگی تھی، اس نے اپنا آپ آنسوؤں کے ہاتھوں میں سوئپ دیا تھا، اسے یوں لگ رہا تھا کہ اب زندگی کا دائرہ اس پہ مزید تنگ ہوتا جا رہا ہے، اب اس کے سامنے پل صراط ہے اور وہ پہلے ہی قدم پہ جھٹکا کھا کے ”آگ اور اذیت“ کے گہرے کنویں میں جا گرے گی اور سچ سچ وہ رات بھر اپنے آپ کو اسی کنویں میں تڑپتے ہوئے دیکھتی رہی، جہاں کوئی بھی اس کے کام نہیں آ سکتا تھا، جہاں صرف اور صرف اچھے اعمال کا وجود کام کر سکتا تھا۔ لیکن اچھے اعمال کے لئے وہ اپنے گزشتہ حالات پہ نگاہ دوڑاتی تو یقیناً سہم جاتی، دل و دماغ پہ خوف سا طاری ہو جاتا تھا اور اب اپنے آپ کو مزید سزا دینے کے لئے تیار کرنے کا سوچتی..... اک ایسے گناہ کے لئے جو اس نے کر کے بھی نہیں کیا تھا اور شاید یہی ”کر کے نہ کرنے“ کا دکھ ہی اس کو رات رات بھر لاتا تھا، وہ اتنی با اعتماد، بہادر لڑکی اپنے ماضی کے سمندر میں اترتی تو بے حد کمزور پڑ جاتی تھی، وہ خزاں رسیدہ پتے کی مانند ہو جاتی تھی، اسے پھر کچھ یاد نہیں رہتا تھا، آج بھی ایسا ہی ہوا تھا اس کی سوچ اور ماضی کا ساتھ فخر کی اذان کے وقت چھوٹا تھا، مؤذن کی آواز پہ.....!





روٹی روٹی سرخ آنکھیں، سپاٹ چہرہ، سرد انداز، اور حرکتیں بہت نپلی تلی سی تھیں جو کسی سنگین طوفان کا پیش خیمہ لگ رہی تھیں..... آفس میں میٹنگ ہونے کی وجہ سے عارفین اس طوفان کا ٹھیک سے اندازہ نہیں کر پا رہا تھا..... ڈیڑھ دو گھنٹے میٹنگ میں گزر گئے تھے، اس کے بعد اس کی کسی سے ملاقات کی اپائنٹمنٹ تھی، پھر لنچ ٹائم میں بھی موقع نہیں مل سکا تھا، مگر اندر ہی اندر اس کا اضطراب اور بے چینی بڑھتی رہی تھی، شام پانچ بجے کے قریب جب وہ سب سے آخری فائل کی تفصیلات لے کر روم میں آئی تو عارفین ایک سینکڑی بھی تاخیر کئے بنا اپنی چیز ڈھکیل کر اٹھ گیا تھا اور روٹی سے پہلے وہ اس کے قریب آکھڑا ہوا تھا، لیکن پھر بھی وہ فائل کھول کر اسے کام کی ڈشیل بتانے لگی۔

”رشید صاحب کا کہنا ہے کہ کل آپ سائٹ پہ کام کریں گے اور تمام مزدوروں کے ساتھ آپ کو ایک میٹنگ رکھنا ہوگی، کیونکہ جیسا کام پہلے ہوتا تھا چند دنوں سے ویسا کام نہیں ہو رہا ہے..... اور یہ آفریدی برادرز کی مارکیٹ کا نقشہ تیار ہو چکا ہے، اگر آپ چاہیں تو اس میں.....“

پلیز! پلیز! روٹی! میں یہ سب نہیں سنتا چاہتا، مجھے وہ بتاؤ جو تمہارے اندر زہر کھول رہا ہے، جس کی اذیت تمہارے چہرے پہ تحریر ہے!“ اس نے جھنجھلا کر کہتے ہوئے فائل اس کے ہاتھ سے لے کر دور اچھال دی تھی، اروٹی کا سر جھک گیا تھا، وہ دو قدم پیچھے ہٹتے ہوئے گہری سانس لے کر رہ گئی تھی، اس نے شاید اپنے اور عارفین کے درمیان فاصلہ رکھنا چاہا، لیکن عارفین نے دونوں ہاتھوں سے اسے کندھوں سے تھام لیا تھا اور اس کے اتنے مضبوط شکنجے کے باعث وہ اپنی جگہ سے مزید ہلنے کے قابل نہیں رہی تھی۔

”اروٹی! میں نہیں چاہتا کہ تم مجھے کوئی درجہ دے کر یا پھر اہم جان کر اپنا مسئلہ شیئر کرو..... میں بس اتنا چاہتا ہوں کہ مجھے ایک انسان ہونے کے ناطے اور انسانیت کے تحت ہی سہی پلیز اپنی پراہم بتاؤ، اپنا مسئلہ شیئر کرو، کیونکہ خود پہ اتنے کڑے خول چڑھا رہی ہو؟ کیوں تمہارا عذاب جھیل رہی ہو؟“ اس نے اروٹی کو تختی سے جھنجھوڑ ڈالا تھا اور وہ خود پہ ضبط کے پیرے بٹھاتے بٹھاتے اپنے ضبط کے تمام بند توڑ بیٹھی تھی اور یہ اس کی بے بسی کی انتہا تھی کہ وہ اگلے پل عارفین شیرازی کے سینے سے لگی تڑپ تڑپ کر رہی تھی اور اس کے اس بے بس و بے خود حرکت پہ عارفین اور بھی زیادہ پریشان ہو گیا تھا، کیونکہ اسے پتہ تھا کہ اروٹی حیات کسی چھوٹی سی بات پہ اس قدر حوصلہ ہارنے والی نہیں، مسئلہ یقیناً اس کے اختیار سے باہر تھا..... چند لمحے یونہی گزر گئے، وہ دونوں خاموش تھے..... مگر ان دونوں کی کیفیات بول رہی تھیں..... اروٹی کے آنسو بول رہے تھے پناہ دے، اپنی بے بسی سنار ہے تھے اور عارفین کا دل بول رہا تھا وہ سینے سے لگے اروٹی کو چپ کر رہا تھا اور اس کے آنسو اپنے اندر جذب کر رہا تھا، دونوں کی تسلی لینے اور دینے کا اندازہ بے زبان تھا، مگر پھر بھی بول رہا تھا۔ اروٹی کی ہچکیوں سے لرزتے جسم اور اک روانی سے بہتے آنسوؤں میں بہت شدت تھی اور کچھ ایسی شدت تھی کہ عارفین اسے روک نہیں پایا تھا..... جب وہ بہت زیادہ روپکی تو پھر کافی دیر بعد اس کے گرد اپنا بازو حائل کرتے ہوئے اسے نرمی سے چپ کرانے کی کوشش کی تھی۔

”کسی نے کچھ کہا ہے؟“ بے حد مدھم اور بھاری آواز سے پوچھا گیا تھا۔

”بہروز..... بہروز بھائی میری شادی کرنا چاہتے ہیں۔“ ہچکیوں کے درمیان اس نے عارفین شیرازی پہ ہم پھوڑ دیا تھا۔

”میں شادی کے نام سے بھی نفرت کرتی ہوں..... میں..... میں کبھی شادی نہیں کروں گی، میں خودکشی کر لوں گی، مگر شادی نہیں.....“ وہ پھر بے ربط الفاظ میں بولتے بولتے روپڑی تھی اور عارفین بُری طرح چکرا گیا تھا، وہ بڑی مشکل سے اپنے اعصاب ٹھکانے پہ لایا تھا۔

”پلیز اروئی! کنٹرول پور سیلف، ایسا کچھ نہیں ہوگا، میں..... میں کچھ حل سوچتا ہوں، پلیز تم اس طرح مت روؤ۔“ اس نے اپنے سینے میں منہ چھپائے روتی ہوئی اروئی کو اپنے مضبوط بازوؤں کے حلقے کا احساس دلاتے ہوئے جیسے اپنی ذات کی مضبوطی کا یقین دیا تھا، لیکن اروئی کے ساتھ جو کچھ ہو چکا تھا اس کے ہوتے ہوئے اچھے کی امید وہ کبھی نہیں کر سکتی تھی..... اس پہ آج تک جو بھی مشکل وقت آیا تھا اسے جھیلنا پڑا تھا، وہ مشکل وقت کبھی ٹلا نہیں تھا اور اس بار بھی اسے یقین تھا کہ وہ اس مشکل کے گرداب میں ضرور پھنسائی جائے گی۔

”مسٹر عارفین شیرازی آپ یہ بات جانتے ہیں کہ میں کبھی شادی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی..... میں کبھی شادی کا ذکر بھی نہیں سنا چاہتی..... اس سے بہتر ہے کہ میں اپنے آپ کو ختم کر ڈالوں۔“ وہ عارفین شیرازی کی شرٹ دونوں مٹھیوں میں دبوچے بے حد جذباتی ہو رہی تھی اور عارفین اس کے شانے سہلاتے ہوئے اسے ریلیکس کرنے کی کوشش کر رہا تھا، مگر جیسے ہی وہ اس کے پرحدت لمس سے چوکی اسے کرنٹ چھو گیا تھا، وہ ایک دم اک جھٹکے سے اس کے سینے سے الگ ہوئی تھی۔

”اروئی؟“ عارفین کو اس کی اسی بے مروتی پہ کافی تکلیف ہوئی تھی، اس نے ہاتھ بڑھا کر اروئی کو خود سے قریب کرنا چاہا تھا، لیکن اس سے پہلے کہ وہ اسے اپنے قریب کرتا، اچانک آفس روم کا دروازہ اک دھماکے سے کھل گیا تھا وہ دونوں چونک گئے تھے، سامنے دلیپز میں کھڑی زونکہ شیرازی کافی خشگیں نظروں سے دیکھ رہی تھی اور دونوں کو بیک وقت اپنے غضب سے راکھ کر دینا چاہتی تھی، لیکن زونکہ کے اندر داخل ہونے سے پہلے ہی اروئی اپنے آنسو گرڑتی ہوئی تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔

”اوندہ! تو آفس میں آج کل اس طرح پھرے اڑائے جارہے ہیں؟“ اروئی کو نگوخت سے دیکھتے ہوئے وہ عارفین کے قریب آگئی تھی۔

”زونکہ ایسا کچھ بھی نہیں ہے جو تم سمجھ رہی ہو۔“ اسے زونکہ کا شک نہ جانے کیوں بُرا لگا تھا کہ وہ صفائی دینے لگا۔

”جو میں سمجھ رہی ہوں وہ ویسا نہیں ہے تو پھر ”ایسا“ کیوں ہے؟“ زونکہ نے استہزاء سے انداز میں عارفین کی سفید شرٹ کی سمت اشارہ کیا تھا، جہاں اروئی اور عارفین کی تازہ ترین قربت کی تحریر رقم تھی، عارفین نے سر جھکا کر دیکھا تو خاموش ہو گیا تھا، اروئی کے آنسو اس کی شرٹ کو زباناں دے گئے تھے۔ جب ہی تو زونکہ، عارفین کے کہے پہ نہیں، شرٹ کے کہے پہ یقین کر رہی تھی۔

”بولیں نا، ایسا کیوں ہے؟ کمرے کی تنہائی میں آپ کی صاف ستھری شرٹ کھڑے کھڑے کیسے بھیگ گئی ہے؟ حالانکہ اے سی بھی آن ہے۔“ زونکہ چبا کر بولی تھی۔

”میں تمہیں ہر بات کا جواب دینے کا پابند نہیں ہوں۔“ عارفین کا انداز بھی سخت ہو چکا تھا۔

”آپ یہ کیوں نہیں کہتے کہ آپ کے پاس میری بات کا کوئی جواب ہی نہیں ہے۔ آپ ہم سے چوری چھپا اس دو ٹکے کی لڑکی کے ساتھ آفس میں عیاشی کرتے پھر رہے ہیں، اسی لئے اسے نوکری سے نہیں نکالا، اسی لئے مجبوریوں کا بہانہ بنا رکھا ہے اور اسی لئے اس پہ دو حرف لعنت کے نہیں بھیجے۔“

”اسناپ اٹ..... جسٹ اسناپ اٹ زونکہ!“ وہ یکدم دھاڑا اٹھا تھا۔

”تم اپنی حد سے بڑھ رہی ہو، آج تک اگر میں نے تمہارے کسی بھی معاملے میں انٹرفیر نہیں کیا تو تم بھی ایسا کرنے کا کوئی حق نہیں رکھتیں۔“



تمہیں اپنی حد میں رہنا چاہئے ورنہ میرے سوائے ہوئے اعتراضات بھی بے دار ہو سکتے ہیں۔“ وہ یک دم غصے سے غرا کر بولا تھا لیکن زونکہ پہ کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ اس نے گھر آ کر بھی اس بات کا کافی فساد پھیلایا تھا۔ رابعہ شیرازی بھی زونکہ کے چاہنے والوں میں سے تھیں۔ انہوں نے بھی توپوں کا رخ عارفین کی سمت موڑا تھا۔

”ابھی تک تمہارا دل نہیں بھرا اس مظلوم، بے چاری، غریب حسینہ سے؟“ رابعہ شیرازی کالب دلجو زونکہ سے بھی زیادہ ہنک آمیز تھا جس پہ عارفین کا ضبط جواب دے گیا تھا۔

”بس بہت ہو گیا یہ فضول کا داویلا۔ آپ لوگوں نے حد کر ڈالی ہے۔ میری خاموشی اور میری شرافت کا ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں آپ سب۔ لیکن میری بات یاد رکھ لیں کہ آپ نے جو کچھ کرنا تھا، کر لیا۔ اب میری باری ہے۔ اب میں حد کروں گا اور آپ لوگ دیکھیں گے کیونکہ مجھے ایسا کرنے پہ آپ مجبور کر رہی ہیں۔“

وہ غصے سے کہتا پلٹ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا دھاں سے نکل گیا تھا اور رابعہ شیرازی خفگی سے زونکہ کی سمت پلٹی تھیں۔

”کیا ضرورت تھی اسے اتنا غصہ دلانے کی.....“

”لیکن مام! وہ اس لڑکی کے ساتھ کمرے میں.....“ زونکہ نے کچھ بولنا چاہا تھا۔

”اگر تم نے اس لڑکی کو عارفین کے ساتھ دیکھ ہی لیا تھا تو درگزر کر جاتیں، کبھی موقع ملتا تو ہم اس لڑکی کا دماغ ٹھکانے لگا دیتے۔ آخر تمہیں پتہ بھی ہے کہ وہ اسے پسند کرنے لگا ہے لیکن سویٹ ہارٹ پسند کب تک چل سکتی ہے، کب تک وہ چوری چھپے اس کے ساتھ وقت گزار سکتا ہے؟ آخر کار لوٹ کے تمہارے پاس ہی آئے گا۔ یہ صرف وقتی جذبات کا اثر ہے جو اسے اس کی قربت سے دور نہیں ہونے دے رہا اور تم جانتی ہو، جذبات کا دریا کتنی جلد اتر جاتا ہے۔“ رابعہ شیرازی نے اپنی لاڈلی چہیتی بھانجی کا کندھا تھپکا تھا اور زونکہ مطمئن ہو گئی تھی۔

”پھر اب کیا کروں۔“ انداز میں ٹھکرتھا۔ رابعہ شیرازی بھانجی کے سوال پہ مسکرا دیں۔

”اب اس کے پاس جا کر بہت ”اچھے“ انداز میں سوری کرو اور اس کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرو۔ اگر وہ سچ مجھ غصے میں آ کر کچھ کر بیٹھا تو پراہم ہو جائے گی۔“ انہوں نے زونکہ کو مشورہ دیا تھا اور وہ سر ہلا کر کچھ سوچنے لگی تھی۔



”اروئی بیٹا..... ادھر آؤ میرے پاس۔“ بہروز بھائی نے رات کے کھانے سے فارغ ہوتے ہی اروئی کو اپنے پاس بلایا تھا۔ وہ سارہ کے ساتھ مل کر برتن سمیٹ رہی تھی، بھائی کے بلانے پہ برتن کچن میں چھوڑ کر ان کے پاس آ بیٹھی تھی۔

”کیا بات ہے بھائی! آپ ٹھیک تو ہیں نا۔“ اروئی ان کی طرف سے فوراً ہی پریشان ہو جاتی تھی۔

”ہاں بیٹا! ٹھیک ہوں، اللہ کا بڑا کرم ہے۔“ وہ دل کی گہرائیوں سے اپنے رب کے شکر گزار ہوئے تھے۔

”آپ ہمیشہ اروئی آپنی کو اپنے پاس بلا کر بٹھاتے ہیں اور باتیں کرتے ہیں، کبھی مجھے بٹھایا آپ نے، کبھی میرا خیال آیا آپ کو؟“ سارہ

کچن سے نکلتے ہوئے کافی نروٹھے پن سے بولی تھی اور بہروز بھائی اس اچانک شکوے پر بے ساختہ ہنس پڑے تھے اور ساتھ ہی اسے بھی قریب آنے کا اشارہ کیا تھا۔

”پگلی! کچھ باتیں صرف بڑوں سے کرنے کے لئے ہوتی ہیں، بچوں سے نہیں۔ تم ابھی بچی ہو اور بچی ہی رہو اور اس بچپن میں فائدہ بھی ہے اور بھلا بھی۔ اور ویسے بھی جو بات میں اروئی سے کرنا چاہتا ہوں، وہ تم سے کیسے کر سکتا ہوں؟ تم تو ہو ہی چھوٹی سی بچی۔“ انہوں نے بہت پیار سے کہتے ہوئے سارہ کو بازو کے حصار میں لے کر نرمی اور وضاحت سے سمجھایا تھا۔

”کالج میں پڑھتی ہوں اور ابھی بھی چھوٹی سی بچی ہوں؟“ اس نے زحمت سے کہا تھا اور اروئی کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

”پہلے تم گرما گرم چائے لے کر آؤ نا پھر بات بھی بتاتے ہیں۔“ وہ اس کی شرارت سمجھ چکے تھے۔

”چائے تو میں لے آتی ہوں لیکن آپ کو یہ بھی بتا دیتی ہوں کہ مجھے اس بات کا پتہ ہے۔“ سارہ معنی خیزی سے کہتے ہوئے اروئی کو دیکھنے لگی تھی اور اروئی اس کی ذومعنی بات کا مطلب سمجھ کر اپنی جگہ پہنچ رہی تھی اور اس کی رنگت بھی پل میں متغیر ہوئی تھی۔

”کیا پتہ ہے بھی؟ تمہیں کس نے بتایا؟“ بہروز بھائی مسکرا کر بولے تھے۔

”بھابی نے..... وہ کہہ رہی تھیں کہ اروئی آپنی کی بات جرات بھائی کے ساتھ طے ہونے والی ہے۔ باقی سب تو ٹھیک ہے، بس اروئی آپنی سے پوچھنا باقی ہے۔“ سارہ نے اروئی کے دل کو لرزاکے رکھ دیا تھا، وہ کچھ بھی دیکھے سنے بنا کھڑی ہو گئی تھی۔

”اروئی! کہاں جا رہی ہو، بیٹھو بیٹا۔“ بہروز بھائی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر دوبارہ بٹھالیا تھا لیکن اروئی کا جسم برف کی مانند ٹھنڈا پڑ چکا تھا، اس کے لئے مشکل یہ تھی کہ بات کرنے والے بہروز بھائی خود تھے اور باپ اور بھائیوں کے سامنے اپنا اعتماد بحال رکھنا ایک مشرقی لڑکی کے لئے انتہائی مشکل امر تھا۔ چاہے وہ لڑکی بنیادی طور پر کتنی ہی پراعتماد اور بولڈ کیوں نہ ہو۔

”دیکھو بیٹا! چند دن پہلے یسری نے تم سے بات تو کی ہوگی، تم اس بات کے متعلق.....“

”بھائی! میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے، میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتی ہوں۔“ زندگی میں پہلی بار اروئی نے بھائی کی بات سنے بغیر اپنی بات کہی تھی۔ اندر سے کچھ برا تو لگتا تھا لیکن جو کچھ وہ کہنا چاہ رہے تھے، وہ اس سے بھی زیادہ برا تھا۔ لہذا اسے بہانا بنانا پڑا تھا۔ بہروز بھائی بات کرتے کرتے ٹھٹھک گئے تھے۔ وہ اروئی کے چہرے سے ہی اذیت کے آثار بھانپ گئے تھے اور انہیں یقین ہو گیا کہ وہ حقیقتاً کچھ ڈسٹرب ہے۔ ”ٹھیک ہے بیٹا! تم آرام کرو، بعد میں بات کر لیں گے۔“ بہروز بھائی ہمیشہ اپنی تینوں بہنوں کے ساتھ ایک باپ کی طرح پیش آتے تھے۔ اروئی خاموشی سے وہاں سے اٹھ کر اندر کمرے میں چلی گئی تھی اور بھابی نے تیز نظروں سے اروئی کی پشت کو گھورا تھا، انہیں شوہر پہ بھی غصہ آیا تھا جنہوں نے بات کرتے کرتے بھی بات پوری نہیں کی تھی اور معاملہ پھر کسی وقت پہنچا لیا تھا جبکہ دوسری طرف جرات زور دے جا رہا تھا۔

<http://kitaabghar.com>  <http://kitaabghar.com>



وہ صبح آفس جانے کے لئے تیار ہو کر نیچے آیا تو کافی عجلت میں تھا کیونکہ وہ حانی سے لاڈ پیار کرنے کے چکر میں آفس سے خالصتاً ہو چکا تھا لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ اس وقت ناشتے کی ٹیبل پہ زونکہ شیرازی بھی موجود تھی۔ حالانکہ ان کا ناشتہ اس وقت نہیں، دوپہر کو لُنج ٹائم میں ہوتا تھا اور ایسا کبھی کبھار ہی ہوتا تھا کہ وہ لوگ ایک دوسرے کو صبح کے وقت دیکھتے تھے ورنہ اکثر ایک گھر میں رہنے کے باوجود ان لوگوں کی آپس میں ملاقات رات گئے یا پھر فجر سے ذرا پہلے ہوتی تھی، جب دنیا کے تمام ہنگاموں سے تھک ہار کر انہیں اپنے بیڈروم کی طلب ستاتی تھی۔

”گڈ مارنگ۔“ زونکہ نے چھوٹے ہی اسے وٹ کیا تھا لیکن عارفین نے جواب دینا ضروری نہیں سمجھا تھا۔

”صاحب! ناشتہ لگاؤں؟“ ملازمہ پہلے سے الارٹ کھڑی تھی۔

”ہوں۔“ وہ آہستگی سے سر ہلا کر اپنے کف لکس بند کرنے لگا تھا۔

”تم رہنے دو، میں چائے بناتی ہوں۔“ زونکہ نے ملازمہ کے ہاتھ سے ٹی پاٹ تھام لیا۔

”عذر اچائے بناؤ۔“ عارفین نے سختی سے کہا تو ملازمہ متذبذب میں پڑ گئی تھی جبکہ زونکہ ان دونوں کو نظر انداز کرتے ہوئے کپ سیٹ کر کے رکھتے ہوئے چائے بنانے لگی تھی۔

”عذرا! میں جو کہہ رہا ہوں، وہ تمہیں سمجھ نہیں آرہا۔“ عارفین کو غصہ آیا تھا۔

”میں چائے بنا تو رہی ہوں آپ کے لیے۔“

”مگر میں ملازموں کے ہاتھ سے چائے پینے کا عادی ہوں۔“ وہ ذرا تلخی سے بولا تھا۔

”آج میرے ہاتھ سے پی لیں۔“ زونکہ ادا سے بولی تھی۔

”میں ذرا دیر کے لئے اپنی عادت میں غلل نہیں ڈال سکتا۔“

”عارفین! پلیز کیا ہو گیا ہے آپ کو؟“ زونکہ کرسی وکیل کر اٹھی اور اس کے قریب آتے ہوئے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھنا چاہتا لیکن وہ ناگواری سے پیچھے ہو گیا تھا اور ملازمہ کے سامنے اپنی اس قدر انسلٹ پہ زونکہ کا رنگ بدل گیا تھا۔

”اپنی حد میں رہو زونکہ!“ وہ چپا کر بولا تھا۔

”آپ مجھے حد بتا رہے ہیں، آپ کو پتہ تو ہے میاں بیوی میں کوئی حد نہیں ہوتی۔“ زونکہ نے اپنی کھسیا ہٹ مٹانے کے لئے کہا تھا۔

”جب میاں بیوی کی حدیں جدا ہو جائیں تو خود بخود ان کے درمیان حد بن جاتی ہے اور پھر اس حد میں رہنا ہی بہتر ہوتا ہے۔“ عارفین نے اسے جتایا تھا۔

”عارفین! یہ کس لہجے میں بات کر رہے ہو تم، زونکہ تمہاری بیوی ہے ملازمہ نہیں۔“ رابعہ شیرازی اپنے ڈھیلے ڈھالے نائٹ ڈریس میں ملبوس تیکھے لہجے میں کہتی ہوئی سیڑھیاں اتر آئی تھیں۔ گویا وہ بات سن چکی تھیں

”اونہہ..... بیوی..... میں آپ کو اتنا بتا دینا چاہتا ہوں مام کہ آپ کی زونکہ شیرازی اس وقت تک میری بیوی تھی جب تک وہ ”صرف“

میری بیوی تھی۔ آپ مجھے میری بیوی کا احساس دلانا چھوڑ دیں۔ جو جیسا ہے میں اچھی طرح جانتا ہوں۔“ وہ زونکہ پہ ایک کاٹ دار نظر ڈالتا ہوا اپنا بریف کیس لے کر پلٹ گیا تھا۔

”عارفین..... عارفین.....“ رابع شیرازی پکارتی رہ گئیں مگر وہ نہیں رکا تھا اور زونکہ اپنی جگہ پہ تلملائی ہوئی تھی، اسے رہ کر روئی حیات پہ تاؤ آرہا تھا جو بیٹھے بٹھائے گلے کا پھندا بن گئی تھی۔



”سر! آج آپ سائٹ کا وزٹ کریں گے، بہت سے ورکرز آپ سے میٹنگ کی ڈیمانڈ کر رہے ہیں۔“ اروئی نے اندر آتے ہی آج کا اہم کام بتانا شروع کیا تھا۔ یہ دیکھے اور سوچے بغیر کہ وہ سن بھی رہا ہے یا نہیں۔

”سر..... مسز ہمدانی والا پراجیکٹ بھی آج کل آپ کی توجہ چاہتا ہے۔ منیجر صاحب بتا رہے تھے کہ مسز ہمدانی کو میٹرل پہ تھوڑا اعتراض ہوا تھا، شاید وہ آپ سے کچھ ڈسکس کرنا چاہتی ہیں۔“ اس نے دوسرا اہم کام بھی بتایا تھا لیکن اس بار چونک گئی تھی کیونکہ دوسری طرف مکمل خاموشی تھی اور اسی خاموشی سے ذرا ٹھنک کر اس نے نظریں اٹھا کر عارفین کی سمت دیکھا تھا، وہ کرسی کی بیک سے ٹیک لگائے مسلسل چھت کو گھور رہا تھا۔ اس کی خوبصورت پلکیں (جن کی خوبصورتی کا اعتراف وہ خود بھی کرتی تھی) بس ایک ہی جگہ ساکت ہوئی لگ رہی تھیں اور آنکھیں کسی پتھر کا سا احساس لئے ہوئے تھیں اور خود وہ اتنا خاموش تھا کہ اروئی کو اس کی حالت سے ذرا سا خوف محسوس ہوا تھا اور وہ بے ساختہ ہی اسے مخاطب کرنے پہ مجبور ہو گئی تھی۔

”سر! آپ ٹھیک تو ہیں؟“ آج بہت عرصہ بعد اس کے لمبے میں پہلے والی اروئی بولی تھی لیکن دوسری طرف اس کا انداز ہنوز تھا جس پہ اسے مزید تشویش ہوئی تھی۔

”سر! آپ ٹھیک تو ہیں نا؟“ اس نے آگے بڑھ کر عارفین کے بازو کو چھوا تھا اور اس کا لمس عارفین کی رگ و جان میں گہرے سکون کی مانند اترتا تھا۔

”میں بہت تھک گیا ہوں اروئی!“ اس کی تھکن اس کے انداز سے نہیں، اس کے ایک ایک حرف سے بھی عیاں ہو رہی تھی۔ اروئی کا ہاتھ اس کے بازو پہ..... رکا تھا۔ اس نے فوراً ہاتھ کھینچنے کی کوشش کی تھی مگر عارفین نے اس کا ہاتھ نرمی سے تھام کر اپنی پتھر آنکھوں پہ رکھ لیا تھا۔

”میں بہت تھکا ہوا ہوں اروئی! بہت بے سکون ہو چکا ہوں میں، بہت کمزور پڑ گیا ہوں۔ میرے پاس رہو، مجھے سکون دوا روئی! پلیز مجھے سمجھو، مجھے اپنا بن کے چاہو یا پھر مجھے چاہئے دو۔“ اس کا لہجہ عجیب تھا کہ گھبراہٹ اور ہکا سنا تھا۔ اروئی کا ہاتھ لرز اٹھا، وہ غیر محسوس انداز سے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرنے لگی تھی۔

”سر! پلیز.....“ اس نے کچھ کہنا چاہا تھا۔

”پلیز اروئی! کچھ مت کہو، مجھے کچھ لمحے سکون سے جینے دو۔ بس کچھ لمحے۔“ عارفین کا لہجہ کچھ ایسا تھا کہ اس کا اثر اروئی کے ارد گرد حصار کھینچنے لگا تھا مگر وہ اس حصار میں آنا نہیں چاہتی تھی گو کہ پہلے بھی ان دونوں کے درمیان بہت سے کمزور لمحے آئے تھے اور ان کمزور لمحوں میں بہت کچھ ہوا تھا مگر اب وہ



کوئی بھی کمزور لمحہ افروز نہیں کر سکتی تھی اور نہ ہی ایسا کچھ چاہتی تھی مگر عارفین سکون کے ان لمحوں کو دہرائے جانتا تھا بقول اس کے کہ وہ کچھ دیر جینا چاہتا تھا۔ اس نے اردوئی کے نازک نرم دودھیہا ہاتھ کو آنکھوں سے ہٹا کر اپنے ہونٹوں پہ رکھ لیا تھا اور اردوئی، عارفین کے ہونٹوں کا لمس اسے ہمیشہ کی طرح آج بھی دہکا۔۔۔۔۔ گیا تھا وہ گنگ سی ہو گئی تھی اسے عارفین سے اس حرکت کی ہرگز امید نہیں تھی اسے یقین نہیں آیا تھا کہ زندگی کے اس تلخ مقام پہ آکر بھی وہ ایسا کچھ کرے گا۔

”سر۔۔۔۔۔“ وہ حیرت زدہ سی کھڑی تھی اور عارفین کی اس قدر بے خود جسارت پہ ابھی پریشان ہو رہی تھی کہ اس نے اردوئی کا دوسرا ہاتھ بھی تھام لیا تھا وہ اس کے ہاتھوں کو کبھی آنکھوں پہ سجا رہا تھا کبھی رخساروں پہ اور کبھی ہونٹوں پہ اور اردوئی اس کی دیوانگی پہ ہکا بکا سی رہ گئی تھی وہ شدت جذبات سے اپنی بے قراری اور بے چینی کا ٹھیک سے اظہار بھی نہیں کر پا رہا تھا اس نے اپنے اعصاب یکجا کرتے ہوئے اپنے ہاتھ اس کے ہاتھوں سے چھڑائے تھے لیکن اس سے پہلے کہ وہ پلٹ کر وہاں سے چلی جاتی عارفین نے اس کو اک جھٹکے سے کھینچ کر اپنے سامنے کھڑا کر لیا تھا اور اردوئی اس کے ایسے اچانک حملے پہ لڑکھڑاکے رہ گئی تھی۔

”مجھے میری باتوں کا جواب دے کر جاؤ اردوئی حیات! مجھے بتاؤ میں زندگی جینے کے لئے سکون کہاں سے تلاش کروں؟ تھک چکا ہوں میں۔ میری برداشت کی حد ختم ہو گئی ہے۔ میں تمہارے گھروالوں سے ملنا چاہتا ہوں، میں سب کچھ کلیئر کرنا چاہتا ہوں۔“ عارفین افسردگی کے خول سے نکل کر اب جھنجھلاہٹ اور غصے کا شکار ہو رہا تھا۔

”سر آپ کی باتوں کا جواب سیدھا سا ہے آپ اپنی زندگی جینے کے لئے سکون اپنی بیوی اور بچے میں تلاش کریں، اپنی تھکن اپنی بیوی سے شیر کریں اور بھول جائیں کہ آپ میرے گھروالوں سے مل کر کچھ کلیئر کریں گے جب تک میں نہیں چاہوں گی کچھ نہیں ہوگا ورنہ آپ کی برداشت کی حد نہیں میری برداشت کی حد ختم ہو جائے گی اور آپ مجھے کمزور سمجھ کر اپنے قریب لانے کی یا پھر تنہائی کا فائدہ اٹھانے کی کوشش مت کیا کریں ورنہ میں ریز ان بھی دے سکتی ہوں چاہے میں کتنی ہی مجبور کیوں نہ ہوئی۔“ وہ غصے اور سختی سے کہتی ہوئی عارفین کے ہاتھ اپنے بازوؤں سے جھٹک کر باہر نکل گئی تھی اور عارفین نے ایک زوردار مکا اپنی ٹیبل پہ دے مارا تھا اور کرٹل ٹیبل چکنا چور ہو کر دور تک بکھر گئی تھی اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اک اک چیز تہس نہس کر دے اس کے اندر بہت سا غبار جمع تھا۔

وہ اس قدر ڈسٹرب تھا کہ حافی کو ساتھ لے کر گاؤں چلا آیا تھا اور اس کی اچانک آمد پہ بابا جان اور بی بی جان خوشی سے نہال ہو گئے تھے۔

”میں صدقے جاواں میرے دونوں پتراک ساتھ آئے نے۔“ بی بی جان نے فوری ان دونوں کا صدقہ دیا تھا۔

”جاؤ خانم مہر النساء کو بھی بتاؤ کہ عارفین آیا ہے اپنے بیٹے کے ساتھ۔“ انہوں نے ملازمہ کو بھیجا عارفین بی بی جان کے پاس بیٹھا تھا اور بابا جان حافی کے ساتھ کھینے میں لگے تھے۔

”زولکہ کہاں تھی، اسے بھی اپنے ساتھ لے آتے بیٹا!“ بابا جان نے حافی سے دھیان ہٹا کر عارفین کی تھکن کو جانچا۔

”وہ ایک جگہ رہنے والی عورت ہوتی تو شاید ساتھ لے ہی آتا، گھر نہیں تھی اسی لئے نہیں لایا۔“ اس کی بات کا مفہوم وہ دونوں سمجھ چکے تھے۔

”کیسے ہو عارفین بیٹا؟“ مہر النساء کی خوبصورت دھیمی آواز پہ عارفین نے چونک کر سر اٹھایا تھا سفید بڑے سے دوپٹے میں اپنے آپ کو

ڈھانپے رابعہ شیرازی کی ہم عمر مہر النساء بہت سادہ اور بہت پاکیزہ لگ رہی تھیں ”کاش یہ میری ماں ہوتیں“ اس نے آج تک جتنی بار مہر النساء کو دیکھا تھا اس کے دل میں یہ کاش ضرور پیدا ہوا تھا اور ساتھ ہی اپنے باپ کی بد قسمتی پہ تاسف بھی ہونے لگتا تھا جن کا نصیب مہر النساء کو چھوڑ کر رابعہ شیرازی سے جڑ گیا تھا۔

”عارفین.....“ اسے ایک نلک دیکھتے پکرا نہوں نے نرمی سے اسے دوبارہ مخاطب کیا تھا۔

”جی..... جی السلام علیکم آئنی۔“ اس نے چونکتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھ کر انہیں سلام کیا تھا۔

”والسلام بیٹا“ کیسے ہوا اور آج ادھر آنے کا خیال کیسے آگیا؟“ وہ بی بی جان کے برابر بیٹھ گئیں۔

”بس فرصت ہی نہیں ملتی تھی آج دل کچھ بوجھل سا ہو رہا تھا تو سوچا بی بی جان اور بابا جان سے مل کر ان کی کچھ دعائیں ہی لے لوں۔“

”زونکہ اور رابعہ باجی کہاں ہیں؟ کسی ہیں وہ؟“ وہ بہت نرمی سے اور اپنائیت سے پوچھ رہی تھیں۔

”ٹھیک ہیں وہ لوگ بھی۔“ وہ مختصر کہہ پایا تھا۔

”اور حانی؟“

”حانی وہ بابا جان کے پاس ہے۔“ عارفین نے بابا جان کی طرف اشارہ کیا جو حانی کو بہلانے کی خاطر ایک طرف رکھے پنجرے کے پاس

لے گئے تھے جن میں رنگ برنگ آسٹریلیین طوطے قید تھے اور حانی ان کو دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔

”ارے حانی بھی آیا ہے؟“ مہر النساء کے چہرے پہ خوشی کا رنگ بکھرا تھا اور وہ بے اختیار حانی کے پاس چلی گئیں اور اٹھا کر ساتھ لے

آئی تھیں۔

”بالکل تم پر گیا ہے سارے نین نقوش باپ کے چرائے ہیں اس نے۔“ مہر النساء کی بات پہ عارفین مسکرا دیا تھا اور ان لوگوں کے پاس بیٹھ کر چند

لحوں کے لئے وہ سارا ڈیپریشن بھول گیا تھا۔





”ہیلو اروئی کیسی ہوڈیز؟“ آج سنڈے تھا وہ گھر پہنچی اور اپنے چھوٹے چھوٹے کام نپٹا رہی تھی۔

جب پتہ چلا کہ جرار اپنی بہن (ثمینہ بھابی) سے ملنے آیا ہوا ہے اروئی سر جھکا کر نہانے کے لئے ہاتھ روم میں گھس گئی تھی اور بہت اطمینان سے وہ بہت دیر تک شاور لینے کے بعد وہ باہر نکلی تو بھی وہ یہیں تھا، اروئی اس کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن جرار اس سے ملے بغیر جانا نہیں چاہتا تھا وہ اپنے بال خشک کر کے دوپٹہ اوڑھتی ہوئی باہر نکلی ہی تھی کہ اچانک بھابی کے کمرے سے وہ بھی باہر آ گیا تھا۔

”اللہ کا شکر ہے میں ٹھیک ہوں۔“ وہ کہہ کے کچن کی طرف پلٹی تھی۔

”مگنی کا کب تک ارادہ ہے؟“ وہ کافی دیدہ دلیری سے پوچھ رہا تھا۔

”کس کی مگنی؟“

”تمہاری اور میری!“ اس نے کندھے اچکائے۔

”آپ سے کس نے کہا کہ میں آپ سے انگیجمنٹ کرنے والی ہوں؟“ اروئی کا لہجہ تیکھا تھا۔

”تمہارے گھر والوں نے۔“ جرار نے ٹھٹھک کر جواب دیا تھا۔

”گھر والوں سے مراد ثمینہ بھابی نے؟“

”ہاں۔“ اس نے اعتراف کیا تھا۔

”سوری جرار صاحب ابھی میری گھر والوں سے اس ٹاپک پہ کوئی بات نہیں ہوئی لہذا آپ میری طرف سے دل میں کوئی بھی امید مت رکھیں..... اول تو میں نے آپ کے بارے میں سوچا ہی نہیں اور اگر سوچ بھی لیا تو آپ بخوبی جانتے ہیں میرا جواب انکار میں ہوگا اور میرے انکار کی وجہ مت پوچھئے گا بلکہ اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھ لیجئے گا کہ آپ میں عورت کی عزت کرنے کی کتنی صلاحیت ہے؟“ اروئی کچھ بھی خیال کئے بغیر شروع ہو گئی تھی۔

”اروئی پلیز وہ سب کچھ ایک نادانی تھا اب میں سب چھوڑ چکا ہوں۔“ جرار نے کھوکھلے سے انداز میں کہا تھا۔

”آپ نے شاید چھوڑ دیا ہو لیکن مجھے ابھی تک یاد ہے سب۔“ اروئی کا لہجہ سخت تھا۔

”تم پلیز میرے بارے میں ایک بار سوچو تو سہی، میں تمہیں بہت خوش رکھوں گا۔“ جرار نے یقین دلایا۔

”بدرکدار انسان کے ساتھ کوئی خوش نہیں رہ سکتا جرار صاحب۔“ اروئی کے جواب پہ جرار کے لب بھینچ گئے تھے اور وہ اروئی کو سرتاپا دیکھتے ہوئے وہاں سے چلا گیا تھا مگر ثمینہ بھابی کو پتہ لگ گئے تھے۔

”ایسی کوئی بدرکداری دیکھ لی تم نے میرے بھائی کی جو اس پہ اتنا گرم ہو رہی ہو؟“

”یہ سوال آپ اپنے بھائی سے کیجئے گا جس نے جان بوجھ کر میرے لئے پریپوزل بھیجا..... میں اس طرح انکار نہیں کرنا چاہتی تھی مگر آج اس نے خود مجھے بولنے پہ اکسایا ہے۔“ اروئی کا غصہ بھی عروج پہ تھا وہ بھابی کو جواب دے کر اندر چلی گئی تھی جبکہ بھابی پورے گھر میں تہی پھر رہی تھیں اور بہروز بھائی سب سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔



دوروز بعد وہ آفس آیا تو موڈ پہلے سے کافی فریش تھا بی بی جان اور بابا جان جیسے اپنوں سے اپنائیت اور محبت ملی تو دل کا کافی بوجھ ہلکا ہو گیا تھا لیکن دوسری طرف بوجھ کچھ بڑھا ہوا لگ رہا تھا اروئی کا چہرہ پہلے سے زیادہ سنجیدگی لئے ہوئے تھا۔ آج کے کاموں کی ترتیب میں پہلا کام سائٹ پہ جانے کا تھا لہذا اس نے اروئی کو چلنے کا سگنل دیا تھا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو شاید وہ اس کے ساتھ جانے سے کتراتی مگر اس وقت اس کے لئے یہ سہولت تھی کہ مینجر صاحب اور کمپنی کا ڈرائیور بھی ساتھ جا رہا تھا وہ لوگ آگے پیچھے چلتے ہوئے نیچے آئے تو احمر انصاری نے روک لیا۔

”ایکسیو زی سرا!“ عارفین کے قدم تھم گئے تھے۔

”سرفرائیڈے کو میری سسٹر کی انگیج منٹ ہے ہم نے اپنے تمام قریبی رشتہ داروں اور جاننے والوں کو انوائٹ کیا ہے پلیز اگر آپ بھی شرکت کریں گے تو ہمیں خوشی ہوگی۔“ احمر نے انوٹیشن کارڈ عارفین کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا تھا۔

”انشاء اللہ ضرور شامل ہوں گے۔“ اس نے ہامی بھری تھی۔

”اور مس اروئی یہ آپ کے لئے۔“ اس نے دوسرا کارڈ اروئی کی سمت بڑھایا تھا۔

دن بھر کام کے دوران ٹائم کا پتہ ہی نہیں چلا ابھی وہ مزید آگے بڑھ رہے تھے جب عارفین کے پرسنل سیل پہ کال آئی۔

”کیا؟ حانی بیڈ سے گر گیا؟“ عارفین جیسے چیخ اٹھا تھا اور اروئی یکدم لڑکھڑائی تھی اس کے ہاتھ سے منرل واٹر کی بوتل چھوٹ کر نیچے جا گری تھی۔

”تم اس کا خون روکنے کی کوشش کرو اور ابھی ڈاکٹر کے پاس لے کر جاؤ میں ابھی آرہا ہوں۔“ عارفین تیز تیز بولتا واپسی کے لئے پلٹ گیا تھا۔

”سرفلیز میں بھی آرہی ہوں..... پلیز سر رکیں۔“ وہ بمشکل اینٹوں اور پتھروں سے ٹھوکریں کھاتی اس کے پیچھے بھاگی تھی وہ لوگ اس وقت سیکنڈ فلور پہ تھے جہاں سے اترنا بھی ذرا مشکل ہو رہا تھا کیونکہ میز صیوں کا کام زیر تعمیر تھا۔ ڈرائیور کو ہٹا کر ڈرائیونگ سیٹ وہ خود سنبھال چکا تھا گاڑی اشارت ہونے سے پہلے وہ بھی اس کے برابر آ بیٹھی تھی اور پھر سیکنڈوں میں عارفین گاڑی مین روڈ پہ لے آیا تھا اور ساتھ ہی اس نے فون کر کے ملازم کو ہاسپٹل کا بتایا..... عارفین کا ایک ڈرائیور اور گاڑی ہمہ وقت گھر پہ موجود رہتے تھے کہ ایمر جنسی میں کسی کو بھی ضرورت پڑ سکتی ہے۔

”سرحانی..... حانی کو زیادہ چوٹ تو نہیں آئی؟ وہ ہوش میں تو ہے نا؟“ عارفین نے ابھی کال بندی کی تھی کہ اروئی نے اس کا بازو تھام کے بہت بے قراری سے پوچھا تھا اور عارفین اس کے زار و قطار بہتے آنسوؤں کو اور بے قرار لہجے کو دیکھ کر قہم سا گیا تھا..... اروئی کے اندر کیا چیز تڑپ رہی تھی؟ یہ جان کر وہ جیسے خاک ہو گیا تھا۔ کیونکہ عارفین سے زیادہ وہ تڑپتی تھی اروئی کا دل اس کی آنکھوں میں آسا تھا اور پھل پھل کر رہا تھا وہ اتنی مضبوط لڑکی پل میں بکھر گئی تھی ”محض ایک چوٹ پہ۔“ عارفین کو اس کی بے قراری پہ کافی اذیت کا احساس ہوا تھا لیکن پھر خود کو سنبھال لیا۔

”ڈونٹ وری معمولی سی چوٹ ہے ٹھیک ہو جائے گا!“ اس نے اپنے بازو پہ رکھے اس کے ہاتھ کو نرمی سے تھپکا تھا۔

”آپ کے لئے معمولی سی چوٹ ہے مگر.....“ اروئی کچھ کہتے کہتے رک گئی اور پھر گھٹ گھٹ کر رونے لگی تھی اس کا یہ رونا ہاسپٹل پہنچنے تک جاری رہا تھا.....



گاڑی سے اترتے ہی وہ تقریباً بھاگتے ہوئے اندر گئے تھے عارفین اپنی مطلوبہ جگہ پہ پہنچا تو قدم ختم گئے تھے جبکہ اردوئی کے بے قرار قدم پتھر کے ہو گئے تھے..... سامنے ہی زونلہ شیرازی حانی کو گود میں لیے اس کے زخم پہ پٹی کروا رہی تھی اور قریب ہی ان کی ملازمہ عذرا کھڑی تھی عذرا روٹے بلکتے حانی کو لے کر ہاسپٹل جا رہی تھی جب گیٹ سے اندر داخل ہوتی زونلہ گاڑی سے اتر آئی تھی اور پھر عذرا کے ساتھ اسے ہاسپٹل لے آئی تھی..... حانی کی نڈھال سسکیاں اردوئی کے قدموں سے لپٹ رہی تھیں مگر اردوئی کے قدم واپس مڑ چکے تھے عارفین نے حانی کو دیکھ کر اردوئی کو دیکھا وہ منظر سے ہٹ چکی تھی اس کی ساری بے قراری اور سارے آنسو اپنی اپنی جگہ پہ برف ہو گئے تھے سینے کے اندر دل کی جگہ پھر سے پتھر آگرا تھا اور اس پتھر کی نارمل سی بے رنگ اور بے رونق دھڑکنیں پھر سے چل نکلی تھیں۔ کچھ دیر والی اردوئی ہاسپٹل کے اس دروازے کے پتوں بیچ کھڑی رہ گئی تھی جہاں وائٹ کلر کی نیکر اور شرٹ میں ملبوس چھوٹا سا حانی نڈھال ہو جانے کے بعد مرہم پٹی کروا رہا تھا اس کی ماں اس کے پاس تھی، اس کا باپ اس کے پاس تھا پھر وہاں اردوئی کا کیا کام؟ بہت دیر بعد وہ لوگ حانی کو لے کر باہر نکلے تو عارفین کی نظریں اردوئی کو ڈھونڈ رہی تھیں مگر وہ کہیں نہیں تھی۔



دوسرے روز بھی اردوئی کی حالت کچھ ایسی ہی تھی لیکن اب کی بار عارفین کی طبیعت میں بے چینی گھلی تھی۔ وہ اردوئی کی خاموشی اس کی چپ اس کے سپاٹ چہرے سے بہت بے چمن ہو گیا تھا وہ اس سے بات کرنے کا بہانہ ڈھونڈ رہا تھا لیکن آج یہ نہیں کیا چکر تھا کہ اسے بہت سے لوگوں سے ملنا پڑ گیا تھا اور ابھی وہ سب سے فارغ ہوا ہی تھا کہ رابعہ شیرازی آفس چلی آئیں.....!

”عارفین کہاں ہے؟“ انہوں نے اردوئی کو تکیجی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

”جی اپنے روم میں ہیں۔“ اس نے رابعہ شیرازی سے نظر ملائے بغیر جواب دیا تھا اور ٹیبل سے فائل اٹھا کر اس میں مصروف ہو گئی۔ وہ اردوئی پہ ایک سلگتی ہوئی نظر ڈال کر عارفین کے کمرے میں آ گئیں۔ اور وہ جواروئی کو بلانے کا ارادہ رکھتا تھا رابعہ شیرازی کو دیکھ کر ٹھہر گیا تھا۔

”بیٹھے۔“ اس نے مروٹا انہیں مخاطب کر کے کہا تھا ورنہ بہت دنوں سے ان ماں بیٹی کی آپس میں بات چیت نہیں ہوئی تھی۔

”مجھے دو لاکھ روپے کی ارجنٹ ضرورت ہے۔“ انہوں نے بغیر کسی تمہید کے اپنی آمد کی وجہ بتائی تھی۔

”کیش یا چیک؟“ رابعہ شیرازی کی توقع کے خلاف اس نے بغیر کچھ پوچھے ہی کہہ دیا تھا۔

”کیش.....“

”اوکے، آپ میری پی اے سے رابطہ کر لیں، وہ آپ کو ابھی کیش ڈیلیور کروا دے گی۔“

”مجھے تمہاری پی اے کے منہ لگنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“

”لیکن یہ کام وہی کر سکتی ہے۔“ عارفین کو رابعہ شیرازی کے انکار پہ غصہ آیا تھا۔

”تم چاہتے کیا ہو آخر، میں جا کر اس سے روپے مانگوں؟“ رابعہ شیرازی بھی غصے میں آ گئیں۔

”وہ انسان ہے جانور نہیں ہے ماما جان۔“

”وہ تہاری رکھیل ہے اور میں..... اس کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلا نا چاہتی، چاہے وہ رقم میرے گئے بیٹے کی ہی کیوں نہ ہو۔“ انہوں نے ایک آگ کا شعلہ تھا جو عارفین کے جسم پہ لگا دیا تھا، جواباً وہ دھاڑ اٹھا تھا۔

”آپ کی بھانجی جو آج کل ہر مرد کے ہاتھوں کا کھلونا بنی ہوئی ہے جس نے طوائفوں کو بھی مات دے دی ہے، اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔ ماما! آپ نے آج اروئی کے لئے یہ لفظ کہا ہے، آئندہ ایسا کچھ کہا تو ہرگز برداشت نہیں کروں گا۔ آپ کی جگہ اس وقت کوئی اور ہوتا تو میں نہ جانے کیا حشر کر ڈالتا۔“ عارفین کا چہرہ غیض و غضب سے سرخ پڑ گیا تھا اور آنکھیں بھی لہو رنگ ہو گئی تھیں۔

”ہونہہ..... یہ جو تم لوگوں نے آفس میں عشق و عاشقی کا کاروبار کھول رکھا ہے نا، میں اسے خوب سمجھتی ہوں۔ بند کرو اس چکر کو۔ کچھ دے دلا کر فارغ کرو اسے ورنہ میں ایسے لوگوں سے پنپنا خوب جانتی ہوں۔ مجھے اس کے گھر جانے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔“ انہوں نے عارفین کو دھمکی دی تھی۔

”آپ اگر اس کے گھر جاسکتی ہیں تو معاملہ بابا جان تک بھی جاسکتا ہے ماما جان! اور پھر یہاں سے کون فارغ ہوگا، آپ یہ بھی خوب جانتی ہوں گی۔“ عارفین کی دھمکی بھی کچھ کم نہیں تھی، رابعہ شیرازی ذرا ٹھنک گئی تھی۔ بس بابا جان کے نام کے سامنے ہی تو وہ کمزور پڑ جاتی تھیں کیونکہ اصل اختیار بابا جان کے پاس تھا۔ وہ جو چاہتے کر سکتے تھے اور اب کی بار تو ان کے ہاتھ سے عارفین بھی نکل چکا تھا۔



احمر انصاری نے آج پھر بطور خاص فون کر کے اسے آنے کی تاکید تھی اور وہ انکار کرتے کرتے پھر چپ ہو گئی تھی اور احمر اس کی خاموشی سے مطمئن ہو گیا تھا اور مجبوراً اروئی کو آج شام احمر انصاری کی سسٹر کی انگیج منٹ پارٹی میں جانے کے لئے کچھ سوچنا پڑا تھا اور اس سوچنے میں سب سے پہلے چھٹی لینے کا خیال آیا تھا کیونکہ مقررہ وقت سے پہلے چھٹی لے کر اسے مارکیٹ جا کر احمر کی سسٹر کے لئے کوئی گفٹ لینا تھا، اسی لئے اس نے عارفین سے چھٹی کی درخواست کی تھی۔

”کیا بہت ضروری کام سے جانا ہے آپ کو؟“ عارفین نے استفسار کیا تھا۔

”جی سر.....“

”اوکے، آپ جاسکتی ہیں۔“ عارفین نے زیادہ کریدنا مناسب نہیں سمجھا تھا اور اجازت دے دی تھی۔ اروئی جلدی جان چھوٹ جانے پہ شکر ادا کرتی باہر نکل آئی تھی، اس کا رخ مارکیٹ کی طرف تھا۔ روڈ پہ آ کر اس نے رکشہ روکا اور مطلوبہ جگہ بتائی۔ تھوڑی دیر بعد وہ مارکیٹ پہنچ چکی تھی۔ وہ جس چیز کو بھی ہاتھ لگاتی اس کی قیمت آسمان کو چھو رہی تھی۔ بہت دکانوں کے چکر کاٹنے کے بعد اسے ایک نفیس سا سوٹ پسند آیا تھا اور بمشکل جوڑ توڑ کرتے ہوئے اس نے وہ سوٹ خریدا اور پھر اسے گفٹ کی شکل میں پیک کر دیا تھا۔

”اگر آپ کو مارکیٹ ہی آنا تھا تو مجھے بھی بتا دیتیں، میں بھی ساتھ ہی آ جاتا۔“ وہ شاپ سے باہر نکل رہی تھی، جب عارفین مگرا گیا تھا۔ چونکہ وہ بھی انوائٹ تھا، اس لئے اروئی کی طرح گھر جانے سے پہلے اس نے بھی گفٹ لینے کا ہی سوچا تھا۔



”کیا میری ہیلپ کر سکتی ہیں؟“ عارفین کی نظریں اروئی کے چہرے پہ ثبت تھیں۔

”آپ اس کام میں کافی ٹریڈ ہیں، آپ کو ہیلپ کی کیا ضرورت؟“ اروئی نے طنزیہ کہا۔

”میں نے آج تک اپنی بیوی کے علاوہ کبھی کسی کے لئے کچھ نہیں خریدا، اسی لئے کسی پسندنا پسند کا قطعی اندازہ نہیں ہے۔“ عارفین نے

دلچسپی سے کہا تھا۔

”جو شخص اپنی بیوی کے لئے خرید سکتا ہے، وہ کسی کے لئے بھی خرید سکتا ہے۔“ اروئی بے وجہی طنزیہ ہو رہی تھی، اسے عارفین کا معصوم بننا

بالکل اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

”جو چیزیں“ میں اپنی بیوی کے لئے خریدتا ہوں وہ ”چیزیں“ کسی اور کے لئے کیسے خرید سکتا ہوں مس اروئی؟“ اروئی کی تکرار دیکھ کر نہ

چاہتے ہوئے بھی عارفین ذو معنی بات کہہ گیا تھا اور حسب توقع اس کا چہرہ سرخ پڑ گیا تھا۔ اب یہ فرق کرنا مشکل تھا کہ شرم سے سرخ ہوا ہے یا غصے سے؟

”آپ اپنی حد سے بڑھ رہے ہیں سر.....“ وہ دبے لہجے میں بولی تھی۔

”میری حد کو آپ ہی تو کرید رہی ہیں۔ بار بار میری بیوی کا مقابلہ دوسروں سے کر رہی ہیں۔ اب میں یہ بھی نہ بتاؤں کہ میں نے آج تک

اپنی بیوی کے لئے ”کیا کچھ“ خریدا ہے؟“ عارفین نے اروئی کی بولتی بند کر ڈالی تھی۔

”آئیے پلیز، میری تھوڑی سی ہیلپ کروادیتجئے۔“ عارفین نے اروئی کا ہاتھ تھامتے ہوئے آگے بڑھنے کی کوشش کی تھی۔

”اروئی! کیسی ہوڈیز.....“ عارفین کے عقب سے نکل کر کوئی سامنے آ گیا تھا۔

”جرار.....“ اروئی کا رنگ متغیر ہو گیا تھا جبکہ جرار، عارفین کے ہاتھ میں دبے اروئی کے ہاتھ کو دیکھ رہا تھا جس پہ اروئی مری طرح چکرا گئی تھی لیکن

عارفین نے اس کا ہاتھ پھر بھی نہیں چھوڑا تھا۔

”لگتا ہے کافی بڑی ہو؟“ جرار نے تمسخرانہ لہجے میں کہا تھا۔

”او کے پھر کبھی ملاقات ہوگی، بائے۔“ وہ خباثت سے مسکراتا ہوا وہاں سے ہٹ گیا تھا لیکن اروئی کی حالت غیر ہو گئی تھی۔

”اروئی! پلیز سنبھالو اپنے آپ کو، وہ انسان تھا کوئی بھوت نہیں تھا جو تمہیں کھا جائے گا۔“

”وہ انسان نہیں، شیطان ہے۔ انتہائی ذلیل شخص ہے وہ۔“ اروئی اپنا ہاتھ چھڑاتی تیزی سے پلٹی تھی۔

”لیکن کچھ بتاؤ تو سہی، کون تھا وہ؟“ عارفین الجھ رہا تھا۔

”میری بھابی کا بھائی ہے وہ، اسی نے میرے لئے پرنسپل بھیجا تھا اور میں نے انکار کر دیا تھا۔“ اروئی اسے مختصر بتاتی وہاں سے بھاگ

نکل گئی تھی۔ اسے پتہ تھا کہ وہ ضرور کوئی فساد پیدا کرے گا۔



بہت عجلت میں وہ گھر پہنچی تھی لیکن وہاں ایسا کچھ بھی نہیں تھا جو روٹی کو مزید پریشان کرتا، البتہ بھابی کی نظریں اسے سرتاپا کھوج رہی تھیں۔ چھتی ہوئی، کھوجتی ہوئی نظریں اروٹی کو کچھ نہ کچھ باور کروا ہی چکی تھیں۔

”تھوڑی دیر پہلے جرار کا فون آیا تھا، بتا رہا تھا اروٹی کو مارکیٹ میں دیکھا ہے۔ شاید کوئی شاپنگ کر رہی تھی؟“ بھابی نے گزرتے گزرتے بھی طنز کا تیر چھوڑ ہی دیا تھا۔ اروٹی پانی پینے کی غرض سے صحن میں چار پانی پیامی کے پاس بیٹھی ہوئی تھی جب بھابی کے چھوڑے ہوئے تیر پاندر سے گھبرا گئی تھی۔ امی نے نارل سے انداز میں سوالیہ نظروں سے اس کی سمت دیکھا تھا۔

”جی وہ ہمارے آفس کے ایک کو لیگ ہیں، ان کی بہن کی آج انگریج منٹ ہے، انہوں نے مجھے بھی انوائٹ کیا تھا، اس لئے ان کی بہن کے لئے گفٹ لینے گئی تھی۔“ آج پہلی بار گھر والوں کے سوال میں اسے شک کی بو آئی تھی اور یہ شک پیدا کرنے والا جرار تھا۔

”تمہارے ساتھ شاپنگ کرنے والا دوسرا کون تھا؟“ بھابی نے مزید استفسار کیا۔ اروٹی ”جوڑ“ تو پہلے ہی تھی، اب اسے اپنی چوری پکڑے جانے کا خدشہ ہو گیا تھا۔

”میرے ساتھ شاپنگ کرنے والا اور کوئی نہیں تھا، وہ تو میں شاپنگ کر کے باہر نکل رہی تھی جب ہماری کمپنی کے باس بھی وہیں شاپنگ کرنے آ گئے۔ وہ بھی آج کی پارٹی کے لئے ہی گفٹ خریدنے آئے تھے۔“

”اوہ..... وکر کر اور باس ایک ہی شاپنگ سنٹر سے شاپنگ کرتے ہیں؟“ بھابی کو بات بڑھانے کا بہانہ مل گیا تھا اور وہ اچھی خاصی بات بڑھا رہی تھیں۔

”ایسی بات نہیں ہے، وہ شاپنگ سنٹر ہمارے آفس سے ذرا قریب ہے، اس لئے اکثر سب ہی وہاں ہی جاتے ہیں۔“ اروٹی نہ چاہتے ہوئے بھی وضاحت دینے پر مجبور تھی۔

”جاؤ بیٹا، منہ ہاتھ دھو کر فریش ہو جاؤ، سارہ چائے بنا رہی ہے، تم بھی چائے لے لو۔“ امی نے اروٹی کو باتوں میں الجھنے سے بچا لیا تھا کیونکہ انہیں پتہ تھا کہ شہینہ اسی طرح بات کو طول دیتی رہے گی۔ سارہ بھی کچن میں کھڑی بھابی کی بحث سن کر ناک بھوں چڑھا رہی تھی۔ اروٹی اٹھ کر اندر چلی گئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے نہا کر اپنے آپ کو تازہ دم کیا تھا اور پھر چائے پینے بیٹھ گئی تھی۔

”آپنی! کیا پارٹی بہت بڑی ہے؟“ سارہ نے نہ جانے کیوں پوچھا تھا اور اروٹی نہ جانے کیا سمجھی تھی۔

”کیوں، کیا تم بھی جانا چاہتی ہو؟“ اروٹی نے کپ ہونٹوں سے ہٹاتے ہوئے پوچھا تھا۔

”نہیں، بس ایسے ہی پوچھ رہی تھی۔“ سارہ نے نفی میں گردن ہلائی تھی۔

”ارے یار! اگر جانا چاہتی ہو تو چلو میرے ساتھ بلکہ اٹھو شاہرے لے کر دوسرے پکڑے پہنو، گرمی کافی ہے اس لئے نہا کر فریش ہو جاؤ گی۔“ اروٹی نے سارہ کے کندھے پر ہتھکی دے کر اسے چلنے کا کہا تھا۔ دراصل اندر سے اروٹی بھی اپنے لئے کوئی سہارا چاہ رہی تھی کیونکہ تھوڑی دیر پہلے جرار کی وجہ سے اسے جس شک کا سامنا کرنا پڑا تھا، وہ رات کے وقت اکیلے پارٹی میں جا کر اس شک کو پختہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔





”اللہ اس طرح بھی مرادیں پوری کرتا ہے، مجھے ہرگز اندازہ نہیں تھا۔“ اروئی کو دیکھ کر احمر انصاری کی نظریں سارہ کے چہرے پہ ٹھہر گئی تھیں۔ اروئی اس کی بات پہ چونک گئی تھی اور سارہ کی نگاہیں جھک گئیں کیونکہ احمر انصاری..... اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

”لگتا ہے ہم لوگ ذرا جلدی آگئے ہیں۔“ اروئی نے بات نظر انداز کر ڈالی تھی۔

”ارے نہیں نہیں، آپ لوگ مقررہ وقت پہ ہی آئے ہیں۔ اندر آئیے، بہت سے لوگ آپ کے آنے سے پہلے ہی آچکے ہیں۔“ احمر نے فوراً اروئی کی بات کی تردید کی تھی اور ان دونوں بہنوں کو لے کر اندر آ گیا تھا۔ فنکشن میں موجود بہت سے لوگوں نے ان کی طرف دیکھا تھا جن میں عارفین شیرازی بھی شامل تھا۔ اروئی کے ساتھ دوسری لڑکی کون تھی، عارفین کو زیادہ غور نہیں کرنا پڑا تھا، وہ اس کے ساتھ سارہ کو پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔

”مام! ان سے ملیے، یہ میری کولیگ اروئی حیات..... اور یہ ان کی چھوٹی بہن ہیں سارہ حیات.....“ احمر نے بطور خاص شیخ کے قریب جا کر ان کا تعارف کروایا تھا اور احمر کی مام ان کا تعارف سنتے ہی نیچے اتر آئی تھیں۔ انہوں نے اروئی اور سارہ کو باقاعدہ گلے لگا کر ان کے رخساروں پہ پیار کیا تھا۔

”ماشاء اللہ دونوں بہنیں ہی بہت پیاری ہیں، کسی ایک کا انتخاب تو سچ مجھ بہت مشکل کام ہے۔“ وہ مسکرا کر بولیں تو اروئی ایک بار پھر چونک اٹھی تھی۔ اس نے فوراً احمر کی سمت دیکھا جو بے دھیانی میں سارہ کی سمت دیکھ رہا تھا اور پھر اروئی کو کچھ نہ کچھ معاملہ سمجھ آ ہی گیا تھا اور احمر انصاری کی اپنے آگے پیچھے پھرنے والی تھی بھی سلجھ گئی تھی۔ نہ جانے کیا بات تھی کہ اروئی کو ایک پل میں ہی بہت ہی اچھا سا احساس ہونے لگا تھا۔

”آئیے میں آپ کو اپنی سسر سے ملواتا ہوں۔“ وہ ان دونوں بہنوں کو ساتھ لے کر شیخ پہ آ گیا تھا۔ خوبصورت نفیس سے..... لینگے میں قیمتی جیولری پہنے، لائٹ میک اپ کے ساتھ دہن بنی بیٹھی احمر کی سسر ان دونوں بہنوں کو دیکھ کر بے پناہ خوش ہوئی تھی اور اس وقت ایسی ہی خوشی اروئی کے چہرے سے بھی عیاں ہو رہی تھی۔

”مس اروئی! آپ کو مسز وقار یاد کر رہی ہیں۔“ احمر کی اطلاع پر اروئی نے ٹھٹھک کر اس کی نظروں کی تعاقب میں دیکھا تھا۔ مسز وقار نے مسکرا کر اسے ہاتھ ہلایا تھا۔

”سارہ! تم فاریہ کے پاس بیٹھو، میں تھوڑی دیر میں آتی ہوں۔“ اروئی اسے احمر کی سسر کے پاس بٹھا کر خود نیچے آ گئی تھی۔

”ہیلو میم! کیسی ہیں آپ؟“ مسز وقار عارفین کی کولیگ تھیں، کافی عرصہ عارفین نے ان کے ساتھ پراجیکٹ پہ کام کیا تھا، جب ہی اروئی سے ہیلو ہائے تھی۔ وہ ذاتی طور پر اروئی کو کافی پسند کرتی تھیں کیونکہ وہ خاصی مخفی لڑکی تھی۔

”آج آپ مسٹر عارفین کے ساتھ نظر نہیں آرہیں، کیا جاب چھوڑ دی ہے؟“

”نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ احمر صاحب نے مجھے ذاتی طور پر انوائٹ کیا تھا، اس لئے میں اپنے گھر سے اپنی سسر کے ساتھ آئی ہوں۔“

اروئی نے وضاحت دی۔

”ویسے یار! اگر تم کبھی بھی عارفین کی جاب چھوڑ دو تو اگلی جاب کے لئے مجھے مت بھولنا۔ میں تمہیں اپنا پیانے رکھ کر خوشی اور ریلیکس فیل

کروں گی۔“ مسز وقار کی آفر پہ ارووی کے کان کھڑے ہو گئے تھے۔ یعنی وہ عارفین کی نظروں سے ہمیشہ کے لئے دور ہو سکتی ہے۔ اس سوچ نے اسے بہت اطمینان بخشا تھا۔

”انشاء اللہ مجھے بھی آپ کے ساتھ کام کر کے خوشی ہوگی۔“ ارووی نے ہامی بھر لی تھی۔

”مسز وقار! بزنس میں غداری تو چل جاتی ہے لیکن رشتوں میں ایسا کوئی کام پھوٹ ڈال دیتا ہے۔ آپ میرے ورکرز کی چین توڑ رہی ہیں۔“ عارفین نے قریب آتے ہوئے مسز وقار سے خفگی کا اظہار کیا تھا۔

”اگر تم اپنے ورکرز کے لئے بہت اچھے باس ثابت ہو رہے ہو تو میری کوشش کے باوجود یہ چین کبھی نہیں ٹوٹے گی اور اگر تمہارے ورکرز کو تم سے شکایت ہے تو وہ چین توڑنے میں لمحہ بھی نہیں لگائیں گے۔“ مسز وقار نے سو فیصد سچ کہا تھا۔

”آپ میرے جس ورکر کو توڑ رہی ہیں، وہ تو پہلے ہی شکایتوں سے بھرا ہوا ہے۔“ عارفین نے مسکرا کر ارووی کے چہرے کو نظروں کی زد میں رکھا تھا، وہ ادھر ادھر دیکھنے لگی تھی۔

”اچھا، وہ کیوں؟“ انہوں نے حیرانی اور دلچسپی سے پوچھا تھا۔

”یہ تو وہی بتا سکتا ہے جسے شکایت ہے۔“ عارفین نے ارووی کو جان بوجھ کر اپنی بات میں گھسیٹا تھا۔

”کیوں ارووی! عارفین سچ کہہ رہا ہے کیا؟ تمہیں اس کی جاب سے شکایت ہے کوئی؟“ ان کے استفسار پہ ارووی جزبزی ہو گئی تھی۔

”نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے لیکن پھر بھی ایک ورکر ہمیشہ ایک ہی جگہ کام کرنے کا پابند تو نہیں ہے نا؟ وہ جب چاہے جہاں چاہے جاب کر سکتا ہے۔“ ارووی نے مسز وقار سے بات کرتے ہوئے عارفین کو بھی سنا دیا تھا۔

”یہ تو تم ٹھیک کہہ رہی ہو لیکن جہاں تک میرا خیال ہے عارفین ایک بہت اچھا باس ہے، وہ کبھی کسی کے ساتھ نا انصافی نہیں کر سکتا۔“ انہوں نے یقین سے کہا تھا اور ارووی کے لبوں پہ طنزیہ مسکان اُٹھ آئی تھی۔ اس کے تاثرات دیکھ کر عارفین چپ ہو گیا تھا، اس سے پہلے کہ ان لوگوں میں مزید کوئی بحث ہوتی، لڑکے والے رنگ پہنانے کے لئے آگئے تھے، ان کے آتے ہی فنکشن میں رونق آگئی تھی۔ عارفین کی ملاقات سارہ سے بھی ہوئی تھی۔ سارہ عارفین سے مل کر ہمیشہ امپریس اور کنفیوزی ہو جاتی تھی، اس کی پرسنالٹی ہی کچھ ایسی بارعب تھی کہ بہت سے لوگ بات کرتے کرتے خود ہی گڑبڑا جاتے تھے۔ یہ تو صرف ارووی کی خود اعتماد شخصیت تھی جو وہ اس کے سامنے ٹھہر جاتی تھی ورنہ کئی ایسی لڑکیاں بھی ملتی تھیں جو بات ہی نہیں کر پاتی تھیں اور سارہ کے ساتھ بھی ایسا ہی ہو چکا تھا، دوبار کنفیوز ہو چکی تھی۔

”کیا میں اتنا خوفناک ہوں کہ آپ سے بات کرنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ آپ ڈر جاتی ہیں؟“ عارفین نے جان بوجھ کر اسے چھیڑا تھا۔

”نن..... نہیں سر..... ایسی بات نہیں ہے۔“ سارہ فوراً گھبرا کے بولی تھی۔ احمر اور عارفین بیک وقت مسکرائے تھے۔

”میں صرف مس ارووی حیات کا ”سر“ ہوں، آپ مجھے بھائی کہہ کر بلائیں گی تو مجھے زیادہ خوشی ہوگی۔“ عارفین نے اسے ”سر“ کہنے پہ ٹوک دیا تھا اور ارووی نے انہماکی سے نظروں سے عارفین کو دیکھا تھا جو سارہ کے ساتھ بہت اپنائیت اور محبت سے باتیں کر رہا تھا اور سارہ حیران ہو رہی تھی۔



اس کا بے تکلف سا انداز دیکھ کر سارہ کو کچھ حوصلہ ہوا تھا اور پھر تھوڑی بہت گفتگو کا سلسلہ چل نکلا تھا۔ اگرچہ اروئی کو ایسی کوئی بھی بے تکلفی یا اپنائیت ہرگز گوارا نہیں تھی لیکن وہ اس طرح منع بھی تو نہیں کر سکتی۔ نہ عارفین کو، نہ سارہ کو۔ واپسی پہ عارفین انہیں ڈراپ کرنے کی آفر دینے ہی والا تھا جب احمر انصاری کی مام نے احمر کو اجازت دی کہ وہ اروئی اور سارہ کو خود جا کر ڈراپ کرائے اور احمر نے بخوشی ان کا یہ حکم مانا تھا، مجبوراً عارفین کو چپ ہونا پڑا تھا اور اروئی بھی کچھ نہ کہہ سکی تھی، انہیں احمر کے ساتھ جانا پڑا تھا۔



”امی! کیا بات ہے، آپ اتنی پریشان کیوں ہیں؟“ بھابی کا سو جا ہوا چہرہ، امی کی پریشان صورت، سارہ کی چپ اور بہروز بھائی کا جھکا ہوا سر دیکھ کر اروئی کو بے حد گھبراہٹ تھی۔

”جرا رات آتا تھا اپنا رشتہ قبول کرنے پہ زور دے رہا تھا لیکن تمہارے بھائی نے انکار کر دیا جس پہ وہ تمہارے کردار پر کچڑا چھالنے لگا اور پھر دونوں کی بات تو تو، میں میں تک چلی گئی اور اس فساد میں تمہاری بھابی صاحبہ پیش پیش تھیں۔“ امی نے جیسے ہی وجہ بتائی، اروئی کی رنگت زرد پڑ گئی تھی اور جسم میں عجیب سردی لہر دوڑ گئی تھی۔

گویا نوبت وہاں تک پہنچ ہی گئی تھی جہاں تک پہنچنے سے اروئی ہمیشہ سے ڈرتی آئی تھی۔

”بب..... بھائی نے کیا کہا تھا؟“ لاکھ کوشش کے باوجود بھی اروئی کا لہجہ لڑکھرائی گیا تھا۔

”اس نے تو بس یہی کہا تھا کہ اگر اروئی اس رشتے کو پسند نہیں کرتی تو ہم اس کی شادی ہرگز نہیں کریں گے اور وہ دل سے ہر امید نکال دے مگر جرا تو نہ جانے کب سے بھرا بیٹھا تھا، وہ تو نہ جانے کیا کیا کہنا شروع ہو گیا تھا، اس نے ذرا لحاظ نہیں کیا، تب ہی بہروز نے اسے گریبان سے پکڑ لیا تھا اور پھر ہم سب نے بیچ بچاؤ کروا دیا۔ بہروز تو تھا ہی بیمار، وہ بھلا کتنا لڑ بھگڑ سکتا تھا۔ بڑی مشکل سے سنبھالا ہے اسے اور وہ ذلیل الٹا دھمکیاں دے کر گیا ہے۔ کہتا ہے، اب آپ کی بیٹی کے کردار کا کوئی ثبوت لے کر آؤں گا۔“

امی اپنی ہی پریشانی میں سب کچھ بتاتی چلی گئیں اور اروئی کا جسم بے جان ہوتا گیا تھا۔ اس کے پاس کوئی ایسی جائے پناہ نہیں تھی جہاں جا کر وہ ہر پریشانی، ہر خدشے، ہر الزام سے چھپ کر بیٹھ جاتی اور اپنے گھر والوں کے لئے وہی اروئی رہتی جیسی وہ اسے سمجھتے اور دیکھتے تھے لیکن کہتے ہیں کہ کسی کے کردار پہ اگر ایک داغ آجائے تو رفتہ رفتہ وہ بہت سے داغوں کی شکل اختیار کر جاتا ہے۔ اروئی کو اپنا آپ بھی کچھ ایسا ہی لگ رہا تھا۔ کسی نے اس کے ایک داغ پہ انگلی اٹھائی تھی اور یقیناً رفتہ رفتہ اس کے دوسرے داغ بھی ہزاروں انگلیوں کی زد میں آنے والے تھے۔ اس کا کردار اچھا لاجانے والا تھا اور وہ آگے بڑھ کے لوگوں کو روک بھی نہیں سکتی تھی کیونکہ ایک حد تک لوگ سچے تھے اور وہ غلط تھی اور ایک حد تک وہ سچی تھی اور لوگ غلط تھے۔



”سرا! میں یہ جاب چھوڑنا چاہتی ہوں۔“ عارفین نمیل پہ اروئی کا ریزائن دیکھ کر چونک گیا تھا، تب ہی اسے بلا کر باقاعدہ استفسار کیا تھا اور جواب اس نے مختصر کہہ کر چہرہ جھکا لیا تھا۔

”کیوں اروئی؟“ وہ بے چین سا ہو کر اپنی چیر سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”آپ کے پاس ”کیوں“ کا کوئی حق نہیں سر۔“ اس کا لہجہ تلخ ہو رہا تھا۔

”سارے حق میرے پاس ہی تو ہیں اروئی! کیوں انکار کرتی ہو میری ذات سے۔“ وہ بے بسی سے بولا تھا۔

”جس انسان کے پاس اپنی ذات کا کوئی مان نہ ہو، وہ دوسروں کو بھلا کیا دے گا؟“ اروئی اسی تلخی سے مسکرائی تھی۔

”میں تم سے ریزائن کی وجہ پوچھ رہا ہوں۔“

”میں کہیں اور جاب کرنے والی ہوں۔“ وہ بھی اسی کے انداز میں بولی تھی۔

”کیوں، کیا تمہیں یہاں جاب کا اچھا ٹیکج نہیں مل رہا؟ کیا کسی اور چیز کی ضرورت ہے؟“ عارفین نے فوراً پوچھا تھا۔

”صرف جاب کے لئے پُرکشش ٹیکج ہی کافی نہیں ہوتا سر! عزت کا بھرپور ٹیکج بھی ملنا بے حد ضروری ہوتا ہے۔ مجھے عزت کی ضرورت ہے

جو فی الحال آپ کے ساتھ رہتے ہوئے مجھے خطرے میں نظر آ رہی ہے۔“ اروئی کا انداز بہت تھکا تھکا سا اور لہجہ تلخی کی آمیزش لئے ہوئے تھا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“

”مطلب صرف اتنا سا ہے سر! کہ آپ میرے کردار کا داغ بنتے جا رہے ہیں اور اس سے پہلے کہ یہ داغ پختہ ہو جائے، میں آپ سے دور

ہٹ جانا چاہتی ہوں۔ بہت عرصہ ہوا میں آپ کے گھر والوں کی کاٹ دار نظروں کو سہہ رہی ہوں مگر سر! اب میرے گھر والے مجھے اپنی کاٹ دار

نظروں کا نشانہ بنائیں، میں یہ ہرگز نہیں سہہ سکتی۔ اب بہت کمزور ہو گئی ہوں، تھک گئی ہوں، اب کچھ سہہ نہیں پاؤں گی، مرجاؤں گی اب تو.....“

اروئی نے آنکھوں کے کنارے تک آئے آنسو بڑی مشکل سے پیچھے دھکیلے تھے۔

”کیسی باتیں کر رہی ہو اروئی! کیا ہو گیا ہے تمہیں، طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔“ عارفین نے اسے کندھوں سے تھام لیا تھا۔

”میں بالکل ٹھیک ہوں، زندہ ہوں، جی رہی ہوں اور کیا چاہئے بھلا۔“ اس نے عارفین کے ہاتھ کندھوں سے ہٹا دیئے تھے۔

”کیوں اکیلی پریشانیوں کا بوجھ اٹھا رہی ہو، پلیز مجھے بتاؤ، مجھ سے شیئر کرو، کیا مسئلہ ہے آخر؟“

”فی الحال تو میرا مسئلہ آپ ہیں اور میں اس مسئلے سے دور جانا چاہتی ہوں۔“ اس نے عارفین کو سرتا پاؤں دیکھا تھا، بے حد تلخ نظروں سے۔

”پلیز اروئی! اپنی ضد چھوڑ دو۔ مجھے سب کے سامنے فاصلے کی یہ دیوار گرانے دو، مجھے بتانے دو سب کو کہ اروئی حیات اکیلی نہیں ہے،

عارفین شیرازی سرتا پاس کا ہے اور اس کے ساتھ ہے۔“

”اونہ..... آپ میرے ساتھ نہیں ہیں تو لوگ مجھ پہ کچڑا چھالنے لگے ہیں اور اگر آپ میرے ساتھ ہوں گے تو یقیناً لوگ سنگسار کر دیں گے

مجھے۔“ وہ پھکی سی ہنسی ہنستے ہوئے بولی تھی۔

”اُف خدایا..... میں کیا کروں؟“ وہ دونوں ہاتھوں میں سر تھام کر چیخ رہی بیٹھ گیا تھا۔

”آپ میرے ریزائن لیٹر پہ سائن کر دیں بس۔“ وہ ابھی بھی اپنے فیصلے پہ قائم تھی۔



”کیا یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے؟“

”جی سرائیہ میرا آخری فیصلہ ہے۔“ وہ دو ٹوک بولی تھی۔

”اوکے، ایز یوش۔“ اس نے فارم کھول کر اس پہ سائن کر دیئے تھے اور اروئی اپنی ذات سے ایک بوجھ ہٹنے کا سکون لئے وہاں سے نکل

آئی تھی۔



”ایسا کیوں کیا تم نے؟ عارفین، اس کی ماں اور اس کی بیوی اتنے اچھے لوگ تھے بیٹا! کیوں ان کی جاب چھوڑ دی۔“ امی کوچ مچ اروئی

کے فیصلے پہ افسوس ہوا تھا۔

”امی! مسز وقار ان لوگوں سے زیادہ اچھی ہیں اور انشاء اللہ ہمارا وقت بھی اچھا گزرے گا، یہ جاب انہوں نے خود آفر کی تھی۔“

”لیکن بیٹا! لوگوں کی باتوں میں آکر جذباتی فیصلے کر لینا عقل مندی تو نہیں ہے نا؟ وہ خبیث جو کہتا ہے، اسے کہنے دو، جنہیں فکر کرنے کی

کیا ضرورت تھی۔“ امی کورہ رہ کر عارفین جیسا اچھا باس یاد آ رہا تھا جنہوں نے مشکل وقت میں ان کا ساتھ دیا تھا۔

”بس امی! جو ہو گیا، اچھا ہو گیا۔ آپ آئندہ کے لئے بہتری کی دعا کریں۔“ اروئی اب عارفین کے ذکر سے بھی دامن چھڑا رہی تھی لیکن

امی کو بہت دیر تک اس کے جاب چھوڑنے پہ افسوس ہوتا رہا تھا۔

”ہاں جی، اپنے آپ کو پاک صاف دکھانے کے لئے دامن جھاڑنا ہی پڑتا ہے۔“ بھابی کسی سے فون پہ بات کر رہی تھیں لیکن باتوں اور

نظروں کا مرکز اروئی ہی لگ رہی تھی۔

”کوئی بات نہیں میری جان! جھوٹ کب تک چھپ سکتا ہے بھلا؟“ وہ یا تو جرار سے بات کر رہی تھی یا پھر فون پہ بات کرنے کا ناک کر

رہی تھیں لیکن جو بھی تھا، نشانہ بہر حال اروئی کی ذات ہی تھی۔

”آپی! میں نے آپ کے لئے شربت رکھا ہے، آپ جلدی سے ہاتھ دھو کر آ جاؤ۔“ سارہ نے بھابی کی باتوں کے پیش نظر اروئی کو وہاں

سے اٹھالیا تھا۔

”ہوں، آ رہی ہوں۔“ وہ اپنے کو حوصلہ دیتی پھر سے ریلیکس ہونے کی کوشش کرتی وہاں سے اٹھ گئی تھی۔

گھر میں عجیب بد مزگی کا عالم تھا، سب ہی ایک دوسرے سے خفا خفا اور نظریں چرائے ہوئے پھر رہے تھے اور اس ساری پتھویشن میں

اروئی اپنے آپ کو ہی قصور وار ٹھہرا رہی تھی۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس چکر، کس مصیبت میں پھنسی ہے اور اب اس کا انجام کیا ہوگا؟ اور انجام

سوچ سوچ کے ہی اسے خوف آ رہا تھا، دل ڈوب سا رہا تھا۔



”زونکہ..... زونکہ..... کہاں گم ہو سویت ہارٹ۔“ رابعہ شیرازی سیڑھیوں سے ہی اسے پکارتی آرہی تھیں۔

”زونکہ تمہارے لئے گڈ نیوز ہے ڈیزر۔“ وہ اس کے بیڈروم کا دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہوئی تھیں۔ زونکہ ابھی ابھی شاور لے کر نکلتی تھی۔ بالوں کو خشک کرتے کرتے ان کے قریب آگئی تھی۔

”مبارک ہو سویت ہارٹ، وہ جادوگرنی عارفین کی جاب چھوڑ کر چلی گئی ہے، اس نے کہیں اور جاب کر لی ہے۔“ رابعہ شیرازی نے خوشی سے بھرپور لہجے میں بتایا تھا اور زونکہ خوشی سے چیخ اٹھی تھی۔

”ریکلی مام! آئی..... آئی کانٹ بلیواٹ؟“ زونکہ نے تولیہ پھینک کر رابعہ شیرازی کو کندھوں سے تمام لیا تھا۔

”آف کورس ڈیزر..... آف کورس.....“ وہ دونوں ہی بے پناہ خوش تھیں، انہیں صحیح معنوں میں آج اپنی کامیابی کی خوشی اور احساس ہو رہا تھا، گویا وہ اپنے پلان میں آج پوری طرح سے کامیاب ہو چکی تھیں۔ اب عارفین بھی ان کا تھا اور حانی بھی ان کا تھا۔ اب بابا جان کے دباؤ میں رہنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی کیونکہ ان کے سر پر لٹکنے والی ”اروی“ نام کی سولی ہٹ چکی تھی۔ اب انہیں کسی چیز کا کوئی خدشہ نہیں تھا، اب عارفین کے پاس زونکہ کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں تھا، اب کروڑوں کی جائیداد اور بینک بیلنس پہ وہ کھل کر راج کر سکتی تھیں، ان کا یہ خدشہ ختم ہو چکا تھا کہ کہیں عارفین زونکہ کو ڈائیورس نہ دے دے۔ اب وہ آزاد تھیں۔

”اف تھینک گاڈ..... مام! مجھے تو جج عارفین کے تیور دیکھ کر ڈر لگنے لگا تھا، میں سوچتی تھی اگر اس کمینٹی نے یہ مطالبہ رکھ دیا کہ زونکہ کو طلاق دے دو تو پھر میرا کیا بنے گا؟ نام نہاد محبت اور پسند کے آگے وقتی طور پر مرد مجبور ہو ہی جایا کرتے ہیں۔ اگر عارفین بھی مجبور ہو جاتے تو.....؟ اف اچھا ہوا وہ ان کی نظروں سے تو دور ہوئی نا۔“ زونکہ زور و شور سے اپنے خیالات کا اظہار کافی خوشی سے کر رہی تھی۔

”ضروری نہیں جو نظروں سے دور ہو، وہ ”دل“ سے بھی دور ہو جائے۔“ عارفین کی بھاری آواز زونکہ کے عقب سے ابھری تھی اور اس کی بات کے مفہوم کو جان کر زونکہ اور رابعہ شیرازی ایک بار پھر چکر اٹھی تھیں۔ وہ دونوں پہ ایک سرد اور طنزیہ نظر ڈال کر آگے بڑھ کر اپنا بریف کیس رکھنے لگا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا۔“ رابعہ شیرازی اپنے تھکے لہجے پہ اتر آئی تھیں۔

”آپ بہت ذہین اور سمجھ دار ہیں ماما جان! میرا مطلب سمجھ چکی ہیں۔“ عارفین اپنی ٹائی کی ناٹ کھولتے ہوئے بہت ریلیکس انداز میں بولا تھا۔

”لیکن میں تمہارے منہ سے سننا چاہتی ہوں۔“ وہ بضد ہوئیں۔

”تو سن لیں ماما جان! اروی میرے آفس سے گئی ہے، میرے دل سے یا میری زندگی سے تو نہیں گئی۔ یہ بھول ہے آپ کی کہ وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گئی ہے۔ وہ ہر لمحہ ہر آن میرے سامنے میرے پاس ہے اور اس کی مثال آپ کے سامنے ہے۔“ اس نے ذرا سا مسکراتے ہوئے دروازے کی سمت اشارہ کیا تھا اور وہ دروازے کی سمت دیکھ کر تپ گئی تھی اور رابعہ شیرازی ایک بار پھر اپنا ٹیمپرز لوز کر گئی تھیں۔

”اس گھٹیا بکاؤ لڑکی میں آخر کیا رکھا ہے جو تم ابھی تک اس کا پیچھا نہیں چھوڑ رہے؟“ عارفین ملازمہ کے ہاتھوں سے حانی کو اٹھا کر ان کی



سمت پلٹا تھا۔

”اس لڑکی میں وہ کچھ ہے جو اس گھر کی دونوں عورتوں میں ”ہرگز نہیں“ ہے، اسی لئے اس کا چچا چھوڑنے کو دل نہیں چاہتا۔“ اس نے کھڑے کھڑے دونوں پہ وار کیا تھا اور دونوں تلملا گئی تھیں۔

”شٹ اپ۔ اپنی زبان کو لگام دو تم اپنی ماں کے ساتھ اب یہ لینگو بیج استعمال کرو گے؟“

”اونہہ..... میری ماں..... لوگوں کے جذبات کا سودا کرنے والی عورت میری ماں ہے، مجھے افسوس ہے اپنی قسمت پر اور اپنے ہونے پر۔“ اس نے نفرت سے سر جھٹکا تھا اور حانی کو بیڈ پہ بٹھا کر خود بھی بیٹھ گیا تھا۔

”میں جانتی ہوں تم کس کی زبان بول رہے ہو، تم چند دن پہلے گاؤں گئے تھے اور مجھے یقین تھا کہ وہ لوگ تمہیں خوب پٹیاں پڑھا کر بھیجیں گے۔ پہلے ایک تھی جادو کرنے والی، اب دوسری بھی مل گئی ہے۔ میرے لئے تو تم ایسا کہو گے ہی۔“ رابعہ شیرازی اب دوسری ڈگر پہ چل نکلی تھیں، بہت عرصہ سے انہوں نے ”گاؤں والی جادوگرنی“ کا چچا چھوڑ کے شہر والی جادوگرنی (اروئی) کا چچا لیا ہوا تھا لیکن آج وہ دونوں بیک وقت یاد آ گئی تھیں۔ لیکن عارفین نے جواباً کچھ بھی نہ کہا تھا۔ وہ جھک کر حانی کو پیار کرنے لگا تھا اور رابعہ شیرازی اس کی بے نیازی پہ دھڑام سے دروازہ بند کر کے چلی گئی تھیں۔



اروئی کو مسز وقار کی کہنی میں کام کرتے ہوئے پورے دو ماہ ہو چکے تھے، انہوں نے سچ سچ اروئی کو عارفین کی جاب سے زیادہ اچھا بیچ دیا تھا۔ وہ حقیقتاً ان کے ساتھ کام کر کے خاصی مطمئن تھی اور ان کا ہر کام کافی توجہ اور ایمانداری سے سرانجام دے رہی تھی۔ اسے عارفین کی جاب چھوڑنے پہ کوئی ملال نہیں تھا۔ بس اتنا ہوتا تھا کہ رات کو بستر پہ لیٹی تو اپنا وہ ”دل“ شدت سے یاد آ جاتا تھا جو وہ عارفین کے پاس چھوڑ آئی تھی۔ پھر رفتہ رفتہ اس دل کی تڑپ، اس دل کی لگن، اس دل کی چاہ جاگ اٹھتی تھی اور پھر اروئی کے لئے بستر بھی کانٹوں بھری بیج بن جاتا تھا اور اپنی دھڑکنیں مسلسل شور کے سوا اور کچھ نہیں لگتی تھیں۔ رات کو اس کی حالت مانی بے آب کی مانند ہوتی تھی اور صبح پھر وہ زندہ انسانوں جیسے چلتی پھرتی سب کے لئے متفکر ہوتی نظر آتی تھی۔ گھر اور آفس کی ذمہ داریاں دن بھر کچھ سوچنے ہی کب دیتی تھیں بھلا؟

”اروئی کس سوچ میں گم ہو بھی طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔“ مسز وقار اس کے کہیں میں آئیں تو اروئی کو گم سم دیکھ کر ٹھہر گئی تھیں۔

”جج..... جی..... میں ٹھیک ہوں۔“ وہ فوراً اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی تھی۔

”او کے تو پھر اسلام آباد جانے کی تیاری پکی ہے نا؟“

”آف کورس میڈم! یہ تو میری جاب ہے، جانا تو ہے۔“ اروی نے کندھے اچکائے۔

”ٹھیک ہی پھر تم اس وقت گھر جاؤ اور فریش ہو کر آ جاؤ، تب تک ہماری فلائٹ کا ٹائم ہو جائے گا۔“ مسز وقار خود بھی اپنے گھر جا رہی تھیں اور جاتے جاتے اروئی کو ہدایت کرنا بھی نہیں بھولی تھیں۔

”او کے میڈم! میں جا رہی ہوں۔“ اروئی کو اب آفس کی طرف سے پک ایڈ ڈراپ کی سہولت حاصل تھی، اس لئے وہ آسانی سے آتی جاتی تھی۔



اسلام آباد میں یہ ایک ایسی میٹنگ تھی جس میں مسز وقار کے علاوہ ملک کے کئی اور نامور آرکیٹیکٹر اور بلڈرز گروپ بھی شامل تھے جن میں عارفین شیرازی کا نام بھی سرفہرست تھا لیکن اروئی نے اپنی بے دھیانی اور مصروفیات میں اس بات پر دھیان ہی نہیں دیا تھا کہ جہاں وہ جا رہی ہے یا پھر جہاں اور بہت سے لوگ بھی ہوں گے وہاں عارفین شیرازی بھی ہوگا۔

شام پانچ بجے وہ مسز وقار کے ساتھ اسلام آباد پہنچی تھی، ان لوگوں کا قیام ایک فائو سنار ہوٹل میں تھا۔ کراچی اور لاہور سے آنے والے وفد کا قیام بھی اسی ہوٹل میں تھا۔ کچھ لوگ تھرڈ فلور پہ ٹھہرے ہوئے تھے، کچھ سیکنڈ فلور پہ اور کچھ کا قیام گراؤنڈ فلور پہ تھا۔ سب کے لئے دو دو کمروں کی بنگ تھی، ایک ان کے لئے اور ایک ان کے پی اے اور سیکرٹری وغیرہ کے لئے۔

مسز وقار کے کمرے کے بالکل سامنے والا کمرہ اروئی کے لئے ریزرو تھا، ان کے کھانے پینے کا انتظام بھی اسی ہوٹل میں رکھا گیا تھا۔ ہوٹل کے منیجر نے ان کا سامان بیڈرومز میں پہنچا دیا تھا اور ان کو کمروں کی چابیاں بھی سونپ دی تھیں۔ وہ لوگ ایک گھنٹہ ریٹ کرنے کی غرض سے اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے تھے۔ ایک گھنٹہ ریٹ کرنے اور فریش ہونے کے بعد وہ لوگ میٹنگ ہال میں پہنچے تھے۔ وہیں پانچ دنوں کا آئنا سامنا ہوا تھا۔ مسز وقار کسی کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے اوپر چلی گئی تھیں جبکہ اروئی نارمل سے انداز میں سیڑھیاں چڑھتی ڈیزائنز کی فائل دیکھتی یہ بھی نہ جان سکی کہ کوئی اس کے قدم سے قدم ملا کر چلنے لگا ہے۔ چونکہ تو وہ تب جب اس کے ہاتھ سے پھسلنے والا سی ڈیز کا الیم کسی دوسرے ہاتھ نے بڑی تیزی سے تھام لیا تھا۔ اس ہاتھ کی مضبوطی اور کلائی پہ بندھی گھڑی اروئی کو چونکا کے رکھ گئی تھی۔ اس نے کرنٹ کھا کے اس کی شکل دیکھی تھی۔ عارفین بہت ترسی ہوئی نظروں سے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ عارفین کی نظریں بہت بے تابی سے اروئی کے ایک ایک نقوش کو اپنے ہونٹوں سے چھوری تھیں۔ پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو دوڑھائی ماہ بعد دیکھ رہے تھے ورنہ تو زیادہ سے زیادہ ایک ہفتے کا ہی گپ آتا تھا۔

”کیسی ہوتی؟“ عارفین نے سی ڈیز کا الیم اس کی سمت بڑھاتے ہوئے جس تشنہ سے انداز میں پوچھا تھا، اروئی نے چاہتے ہوئے بھی اس کے احساس کو محسوس کر گئی تھی۔

”ٹھیک ہوں۔“ وہ اس کے ہاتھ سے الیم لے کر دو لفظ میں بات ختم کر کے وہاں سے چلی گئی تھی اور وہ وہیں کھڑا رہ گیا تھا۔

”سر! چلیں؟“ عارفین کے پی اے نے قریب آتے ہوئے کہا۔

”ہوں۔“ وہ کہہ کے آگے بڑھ گیا تھا پھر میٹنگ ہال میں بھی سب کا دھیان دیوار پہ آں ہونے والے پروجیکٹر کی طرف تھا لیکن عارفین کی نظریں مسز وقار کو مشورے دیتی اور گائیڈ کرتی اروئی کی حیات کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ میٹنگ ہال میں اندھیرا تھا، صرف پروجیکٹر کی روشنی پھیلی ہوئی تھی اور بار بار بدلنے والے سین اس روشنی کو بھی بار بار بدل رہے تھے۔ آج کی اس تین گھنٹے کی میٹنگ میں کل بہت سے بلڈرز گروپ کو فائدہ ہونے والا تھا کیونکہ اسی



میٹنگ کے تھروان کوئے اور مضبوط ترین پاورفل کانٹریکٹ ملنے والے تھے۔ پورے تین گھنٹے کے بعد یہ میٹنگ اپنے اختتام کو پہنچی تھی اور اگلی میٹنگ کل صبح بارہ بجے کے ٹائم پہ فکس کی گئی تھی۔ رات گئے وہ لوگ کھانا کھا کر اپنے کمروں میں واپس پہنچے تھے، سب ہی لوگ صبح سے تھکے ہوئے تھے، اس لئے جلدی سو گئے تھے۔

<http://kitaabghar.com> <http://kitaabghar.com>

رات دو بجے کا وقت تھا، اروٹی کو سوئے ہوئے تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ ہوا تھا، وہ بے حد گہری نیند میں تھی جب دروازے پہ دستک ہوئی تھی۔ گہری نیند کی وجہ سے اسے یہ خیال بھی نہ رہا کہ پہلے پوچھ لے کہ دستک دینے والا کون ہے؟ اس نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا تھا۔

”سر! آپ.....“ عارفین کو اپنے سامنے دیکھ کر اروٹی کی نیند بھک سے اڑ گئی تھی اور آنکھیں پھیل گئی تھیں۔

”ہاں میں، بہت دیر سے اپنے آپ کو روک رہا تھا کہ تمہیں ڈسٹرب نہ کروں لیکن آج اتنے دنوں بعد تمہیں دیکھ کر دل چاہ رہا ہے تم سے بہت سی باتیں کروں اور تمہیں اپنا حال سناؤں۔“ عارفین اندر قدم رکھتے ہوئے بولا اور پھر دروازہ بند کر کے اروٹی کو بازو سے تھام کے صوفے پر بیٹھا تھا۔ وہ ہکا بکا سی حیرت سے گنگ ہو کے رہ گئی تھی۔

”لیکن سر..... اس..... وقت..... آپ..... مم..... میرے کمرے میں.....“ اروٹی کے الفاظ بے ربط سے ہو گئے تھے۔

”اس وقت کے علاوہ فرصت بھی تو نہیں ہے تمہارے پاس۔ تم نے مجھ سے بات کرنا چھوڑ دیا ہے، میرے پاس رہنا میرے سامنے آنا چھوڑ دیا ہے۔ خود بھی اکیلی ہو گئی ہو اور مجھے بھی اکیلا کر دیا ہے۔ تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا اروٹی! پلیز ابھی بھی کچھ نہیں بگڑا، کچھ احساس کرو میرا اور..... اور محسوس کرو اپنے دل کی تڑپ کو۔“ عارفین ہمیشہ اروٹی کے سامنے اپنے کیس لڑتے لڑتے تھک سا جاتا تھا۔ شاید اس لئے کہ اس کی نظروں میں وہ قصور وار نہ ہوتے ہوئے بھی قصور وار تھا۔

”میں نے اپنے سینے میں دل ہی نہیں چھوڑا تو تڑپ کیسے محسوس کروں، کیسے سمجھوں کہ آپ کیا چاہتے ہیں اور میں کیا چاہتی ہوں؟“ وہ اپنا بازو چھڑا کر اس کے قریب سے اٹھ گئی تھی۔

”تم بس دوسروں کی پروا میں نہ اپنا کچھ کرو گی اور نہ میرا کچھ ہونے دو گی۔“

وہ آج اس سے کافی خشکی بھرے شکوہ کنال لہجے میں بول رہا تھا۔

”میرا جو کچھ ہونا تھا ہو چکا، اب مزید کچھ کہنے اور کرنے کی ہمت اور حوصلہ نہیں ہے مجھ میں۔“

”لیکن اروٹی! تم یہ بھی تو سوچو، تم اپنی لا پرواہی میں تین زندگیاں نظر انداز کر رہی ہو، تین زندگیاں کو اپنی سردمہری کی بھیٹ چڑھا رہی ہو۔“ عارفین نے اس کے قریب آتے ہوئے اس کا رخ اپنی سمت موڑا تھا۔

”میں نے آج تک تیسری زندگی کے بارے میں کبھی سوچا ہی نہیں۔ اگر کبھی سوچ لوں تو پھر کسی اور کے بارے میں ”ہرگز نہیں“ سوچوں گی۔ اس تیسری زندگی نے ہی تو میرے سینے میں دل کی جگہ پھر رکھ دیا ہے۔ مجھے پھر بنا دیا ہے اس کی تڑپ نے۔“ بات کرتے کرتے اس کی آنکھوں

میں آنسو بھرائے تھے، تھوڑی دیر پہلے وہ اس تیسری زندگی کو یاد کرتے ہوئے ہی سوئی تھی اور اب اسی کا ذکر عارفین کے منہ سے سن کر اس کا دل بھرا آیا تھا اور آنکھوں کے کناروں پہ سکتے آنسو ایسے بے ساختہ تھے کہ وہ روک بھی نہ پائی تھی۔

”اروئی! میں تمہاری ہمت، تمہارا حوصلہ بڑھانے کو بات کرتا ہوں اور تم ہارے ہوئے لوگوں کی طرح آنسوؤں کو سہارا بنا لیتی ہو۔“ عارفین نے اس کے آنسو پونچھے جو قطار در قطار بہتے چلے آ رہے تھے۔

”مجھ سے زیادہ ہارا ہوا اور کون ہوگا، میں نے ہی تو اپنی زندگی کا قیمتی سرمایہ ہارا ہے۔ اپنا دل بیچا ہے، اپنا جسم بیچا ہے، اپنی ذات کا مان بیچا ہے میں نے۔ میں ایک بکی ہوئی ذات ہوں۔“ وہ اتنے دنوں بعد زخم کرایہ جانے پہ کچھ بھرسی گئی تھی اور اس کو سنبھالتے سنبھالتے عارفین نے اسے بانہوں میں بھینچ لیا تھا اور اس کی مضبوط بانہوں کے حصار میں وہ ٹوٹ کے روئی تھی۔ اس کے تمام حوصلے اور ہمتیں بھی ٹوٹ کے بکھرے تھے، اس کی ہچکیاں عارفین کے سینے میں اتر رہی تھیں۔

رات کے اس خاموش پہرہ دونوں ایک دوسرے کی قربت میں بکھرے ایک دوسرے کو سمیٹ رہے تھے۔ جہاں اس کی ہچکیاں بندھی ہوئی تھیں، وہیں عارفین کی دھڑکنیں اسے تھپک تھپک کر چپ کر رہی تھیں۔ اسے دونوں بانہوں میں بھرے وہ بار بار اس کی پیشانی کو اپنے ہونٹوں کی حدت بخش رہا تھا۔ عارفین کی انگلیاں اروئی کے بالوں کو سہلا رہی تھیں اور کئی بامعنی اور بے نام سے خاموش لفظ ان دونوں کے درمیان گفتگو کا دائرہ کھینچ چکے تھے اور اس دائرے کے اثر میں یہ بات بہت پیچھے چلی گئی تھی کہ ان کی ”حد“ کہاں تک مقرر تھی اور مقررہ حد سے بڑھنا ان کے لئے ٹھیک بھی تھا یا نہیں؟ عارفین ”ایسی“ نیت سے بالکل نہیں آیا تھا مگر پھر بھی قربت ہی کچھ ایسی بن گئی تھی کہ وہ اروئی سے ”دور“ نہیں رہ سکا تھا اور اپنی تنہائی اپنے دکھ پہ روتی اروئی اسے روک ہی نہ پائی تھی اور وہ دونوں قربت کی دبیز گہری وادی میں اترتے چلے گئے تھے۔

دل و دماغ اور جسم کے تعلقات ایک ہی روپ ایک ہی سانچے میں ڈھل چکے تھے۔ یہاں پہ آکر دماغ، دل اور دل جسم سے انکاری نہیں تھا بلکہ جو کچھ بھی تھا سب ٹھیک تھا یا پھر یہ کہ وہ ”حق دار“ تھے اس کے۔





فجر کی اذان پہ اروئی کی آنکھ کھل گئی تھی، اس نے ایک لمبے کے لیے ٹھہر کر آس پاس کے ماحول کو سمجھنا چاہا تھا۔ شاید اسے ماحول کو سمجھنے میں کچھ اور دیر لگتی مگر قریب سوئے عارفین کے گرم جسم کی حدت اور سانسوں کے ارتعاش نے اسے بہت جلد سب کچھ سمجھنے پہ مجبور کر دیا تھا۔ وہ یکدم اٹھنے لگی مگر عارفین کا بازو اس کے سینے پہ دراز تھا جب ہی اسے اٹھنے میں ٹائم لگ گیا تھا۔

”سر! پلیز مجھے اٹھنے دیں۔“ اس نے آہستگی سے اس کا کندھا ہلایا تھا۔

”ہوں، اٹھ جاؤ۔“ وہ ایک بار زور سے اسے ہانپوں میں بھیج کر چھوڑتے ہوئے بولا تھا۔

”ارویٰ بمشکل اپنے ریشمی گھنے بال سمیٹتی ہوئی بیڈ سے اٹھی تھی اور فوراً ہی ہاتھ روم میں گھس گئی تھی۔ پندرہ بیس منٹ شاور لینے کے بعد وہ باہر نکلی تھی، اس کا ارادہ بال خشک کر کے وضو کرنے اور نماز پڑھنے کا تھا، اسی لئے وہ پہلے بال سمیٹ لینا چاہتی تھی۔ اتنے میں اروئی کے موبائل پہ فجر کی نماز کے لئے سیٹ الارم بج اٹھا تھا۔ اروئی الارم بند کرنے کی غرض سے بیڈ سائیڈ کی طرف آئی تھی اور سائیڈ ٹیبل پہ دھرے موبائل سے الارم آف کر دیا تھا اور پھر موبائل واپس رکھتے رکھتے اس کی نظر عارفین کے موبائل پہ جا پڑی تھی۔ نہ جانے کس احساس کے تحت اس نے عارفین کا موبائل اٹھا لیا تھا۔ موبائل کے وال پیپر پہ حانی کی خوبصورت معصومی تصویر جگمگا رہی تھی۔ اروئی کی انگلیاں لرزتے ہوئے اس کے چہرے کو چھونے کی حسرت میں موبائل کی سکرین کو چھو رہی تھیں۔

”حانی.....“ اس کی آواز سرگوشی نما تھی لیکن لہجے میں بہت کچھ سمنا ہوا تھا۔ بہت سے لمبے یونہی سرک گئے۔ وہ اور بھی کچھ دیر اسے دیکھتی رہتی لیکن دروازے پہ ہونے والی تیز اور زوردار دستک نے اسے دھلا کے رکھ دیا تھا۔ عارفین کا موبائل اس کے ہاتھ سے گرتے گرتے بچا تھا۔

”اس وقت کون ہو سکتا ہے؟“ اروئی کو پریشانی ہوئی تھی اور اتنی زوردار دستک پہ عارفین کی نیند بھی ٹوٹ گئی تھی۔ وہ اٹھنے لگا مگر اروئی نے اسے روک دیا تھا۔

”میں دیکھتی ہوں۔“ وہ صورتحال کی سنگینی سمجھتی تھی، اسے پتہ تھا کہ میرے کمرے میں عارفین شیرازی کا موجود ہونا کسی ویٹر کو بھی شک و شبہات میں ڈال سکتا ہے، اسی لئے اس نے عارفین کو روک کر خود باہر دیکھنے کی کوشش کی۔ اس نے ہول سے جھانک کر دیکھا، سامنے ہوٹل کا ویٹر کھڑا تھا۔ اروئی نے مطمئن ہوتے ہوئے دروازہ کھول دیا تھا۔

”جی کیسے؟“ اس نے اس وقت ویٹر کے آنے پہ حیرانی ظاہر کی تھی۔

”کہنے ہی تو آیا ہوں میڈم اروئی حیات.....“ ویٹر کو سائیڈ پہ دھکیل کر جرا یکدم سامنے آیا تھا۔ اروئی جرا کو دیکھ کر چکر اُگئی تھی۔

”جرا..... تم.....“ اس سے کچھ بولا ہی نہ گیا تھا اور جرا کچھ بھی سنے بغیر اروئی کو دھکا دے کر اندر گھستا چلا گیا تھا اور اس کے پیچھے بہت سے لوگ دندناتے ہوئے اندر داخل ہوئے تھے۔

”عارفین شیرازی اپنی سابقہ پی اے اروئی حیات کے ساتھ ہوٹل کے کمرے میں رنگے ہاتھوں پکڑے گئے۔“ کسی اخبار کے صحافی نے با آواز بلند اپنے اخبار کے لئے جملہ (سرفی) ترتیب دیا تھا۔

”یہ کیا تمیزی ہے، کیا بے ہودگی ہے؟“ عارفین نے یکدم اروئی کو اپنے بازو کی اوٹ میں لیتے ہوئے ایک صحافی کے کمرے کا نشانہ بننے

سے بچایا تھا اور اس صحافی پہ کافی گرم ہوا تھا۔

”مسٹر شیرازی رات کے اس پہر آپ مس اردوئی کے کمرے میں کیا کر رہے تھے، کیا پہلے بھی آپ لوگوں میں ”ایسے ہی تعلقات“ تھے؟ اگر آپ لوگ ایک دوسرے کے اتنے قریب تھے تو مس اردوئی حیات نے آپ کی جاب کیوں چھوڑی تھی؟“

بہت سے لوگ طرح طرح کے سوال کر رہے تھے اور اپنی سالوں سے سینت سینت کر رکھی عزت میڈیا والوں کی بھینٹ چڑھتے دیکھ کر اردوئی کے حواس کھونے لگے تھے۔ جبرار میڈیا والوں کو بڑھ چڑھ کے جوابات دے رہا تھا جبکہ اردوئی اور عارفین اپنا کوئی بھی اسٹیٹ منٹ ریکارڈ کروانے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ اردوئی کے حواس ساتھ چھوڑنے لگے، وہ یکدم بے ہوش ہو کر دھڑام سے زمین بوس ہوئی تھی۔ لوگوں کا اتنا ہجوم دیکھ کر یہی لگ رہا تھا جیسے پورا اسلام آباد ایک جگہ ہی جمع ہو گیا تھا اور لوگوں کے انتہائی بے ہودہ کمٹنس سن کر عارفین کا خون کھول اٹھا تھا۔ وہ یکدم دھاڑا تھا۔ اس کی دھاڑ بہت بلند تھی۔ اس نے بے ہوش پڑی اردوئی کو اٹھا کر بیڈ پہ ڈالتے ہوئے دل میں ایک فیصلہ کیا اور پھر سب کو خاموش کر دیا تھا۔

”اردوئی حیات میری بیوی ہے۔ لہذا آپ لوگ اپنی زبان بند رکھیں اور یہاں سے دفع ہو جائیں۔“ وہ ایک ایک لفظ جبا کے بولا تھا اور وہاں موجود پورا ہجوم چونک گیا۔ تمام نیوز پیپر ز اور نیوز چینلز والوں..... میں ہلچل مچ گئی تھی اور ان لوگوں کی عزت کو داؤ پہ لگانے والا جبرار، عارفین کے بیان پہ ہکا بکارہ گیا تھا اور باہر شور کی آواز سن کر آنے والی مسز وقار بھی عارفین کی بات پہ حیران ہو گئی تھیں۔

”آپ غلط بیانی سے کام لے رہے ہیں اور اپنے کروت چھپانے کے لئے نکاح کا بہانا کر رہے ہیں۔“ جبرار یکدم تیزی سے سامنے آیا تھا۔ عارفین کا دل چاہا ایک زوردار گھونسا اس کے منہ پہ دے مارے لیکن وہ اتنے لوگوں کے سامنے ایسی جذباتی حرکت بالکل نہیں کرنا چاہتا تھا، وہ ان سب لوگوں کو رفتہ رفتہ پیچھے دھکیلتا ہوا کمرے سے باہر لے آیا تھا اور ساتھ ہی کمرے کا دروازہ بند کر دیا تھا تاکہ وہ لوگ اردوئی کو گندی نظروں اور بے ہودہ باتوں سے زیادہ نارچہ نہ کریں۔

”کوئی بھی شریف لڑکی کسی غیر مرد کے ساتھ اس طرح رنگ رلیاں نہیں مناسکتی۔ اردوئی حیات رات کے اس پہر اگر میرے ساتھ ایک کمرے میں نظر آرہی ہے تو اس کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ وہ میری بیوی ہے، ہم دونوں کا نکاح ہو چکا ہے۔ ہم دونوں میاں بیوی ہیں، ہم جب چاہے جہاں چاہے ایک ساتھ نظر آسکتے ہیں۔“ عارفین نے جبرار کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھا تھا۔

”کیا ثبوت ہے کہ آپ دونوں میاں بیوی ہیں، نکاح کب ہوا تھا؟ کیا آپ کے گھر والے اس نکاح کے بارے میں جانتے ہیں؟“ کیا اردوئی حیات کے گھر والوں کو پتہ ہے؟ آپ کا نکاح کس شہر میں ہوا تھا؟“ ہر طرف سے سوالوں کی بوچھاڑ ہو رہی تھی اور عارفین ہوٹل کی راہداری میں کھڑا نہ چاہتے ہوئے بھی ان کے سوالوں کے جواب دے رہا تھا، صرف اس لئے کہ اردوئی کے کردار پہ بدچلتی اور بدکاری کا داغ نہ آئے۔

”ہمارا نکاح دو سال پہلے کراچی میں ہوا تھا، اس نکاح کے بارے میں میرے گھر والوں کو پتہ ہے اور ثبوت کے طور پر میں اپنے نکاح نامے کی فوٹو کاپی آپ لوگوں کو دکھا سکتا ہوں جو فی الحال میرے روم میں بریف کیس میں رکھی ہے۔“ عارفین کا لہجہ مضبوط دوٹوک اور سچا کھڑا تھا۔

”عارفین شیرازی جھوٹ بول رہا ہے۔“ جبرار زور سے چیخا تھا۔



”یہ اپنے ناجائز تعلقات کو جان بوجھ کر جائز تعلقات کا رنگ دے رہا ہے۔“

”شٹ اپ..... تم اپنی زبان بند رکھو، تم سے تو میں بعد میں پٹیوں گا۔“ عارفین نے چبا کر کہا اور جرات کو انگلی اٹھا کر وارننگ دی تھی۔

”مئنجر صاحب ہٹائیں ان سب کو ورنہ میں اس ہوٹل کے خلاف کیس کر دوں گا۔ آپ لوگ دوسروں کی پرائیویسی میں اس طرح انٹرفیر کرتے ہیں؟“ بالآخر وہ ہوٹل کے مئنجر پہ چڑھ دوڑا تھا اور مئنجر سچ مچ اپنے ہوٹل کی ریپوٹیشن خراب ہو جانے کے ڈر سے دباؤ میں آ گیا تھا اور فوراً ہی سکیورٹی گارڈز طلب کئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد بمشکل وہاں سے ہجوم ہٹایا گیا تھا اور عارفین تیزی سے اندر اروئی کے پاس آیا وہ ابھی تک ہوش و خرد سے بیگانہ پڑی تھی۔ اس نے ڈاکٹر کو کال کی تھی۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ کی ٹریٹ منٹ کے بعد وہ ہوش میں آئی تھی۔ تب تک رات ڈھل چکی تھی اور دن پوری آب و تاب کے ساتھ روشن ہو چکا تھا اور ساتھ ہی اروئی کے سوئے ہوئے ذہن میں جھماکے ہونے لگے تھے۔

”اب کیسی طبیعت ہے اروئی؟“ مسز وقار نے نرمی سے پوچھا تھا لیکن اروئی، عارفین کو سامنے دیکھ کر پھر سے حواس کھونے لگی تھی۔

”مم..... مجھے گھر جانا ہے.....“ اروئی کو یوں لگ رہا تھا، اگر ایک پل بھی وہ گھر سے دور رہی تو ہمیشہ کے لئے دور ہو جائے گی۔

”اوکے، چلی جانا لیکن پہلے اپنے آپ کو سنبھالو، اپنی حالت دیکھو۔“ پریشان چہرہ اور بھیگی آنکھیں اسے عجیب سا روپ دے رہے تھے۔

”میں ٹھیک ہوں بس مجھے گھر جانے دیں، ورنہ..... ورنہ بہت کچھ بگڑ جائے گا۔ پلیز میم..... مجھے گھر پہنچا دیں۔“ وہ مسز وقار کے سامنے

البتہ کہہ رہی تھی۔ انہوں نے گردن موڑ کر عارفین کو دیکھا، وہ گہری سانس خارج کرتے ہوئے صوفے سے اٹھ کر اروئی کے پاس آ بیٹھا تھا۔

”دیکھو اروئی! جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا ہے، تم ذرا تحمل سے سوچ سمجھ کر قدم اٹھاؤ۔ میں خود تمہارے ساتھ تمہارے گھر جاؤں گا اور تمہارے گھر

والوں کو ساری بات تفصیل سے سمجھاؤں گا۔ تم پلیز حوصلے سے کام لو اور.....“

”مجھے آپ کی کوئی بات نہیں سننی، جو کچھ ہوا ہے آپ کی وجہ سے ہوا ہے، میں ہمیشہ آپ سے کہتی تھی کہ مجھ سے دور رہیں ورنہ میں بدنام ہو

جاؤں گی لیکن آپ نے کبھی میری بات سنی ہی نہیں۔ آپ نے میری عزت دوسروں کی بھینٹ چڑھا کر دم لیا ہے۔ اب میرے گھر والے کیا سوچیں

گے، کیا کہیں گے میرے بارے میں۔“ وہ روتے روتے چیخ اٹھی تھی۔

”اروئی! کچھ نہیں ہوگا، میں..... تمہارے ساتھ ہوں، میں چلوں گا تمہارے ساتھ۔“ عارفین نے اس کے ہاتھ پہ دباؤ ڈالا لیکن اروئی

نے یکدم ہاتھ کھینچ لیا تھا۔

”میں کس منہ سے گھر جاؤں گی، کوئی میرا اعتبار نہیں کرے گا، کوئی میرا سچ نہیں سنے گا۔ میں سب کی نظروں میں بے اعتبار ہو گئی ہوں

صرف آپ کی وجہ سے۔“ وہ بے حد جذباتی ہو رہی تھی اور اس کی حالت کے پیش نظر عارفین نے کراچی کے دوکٹ کنفرم کروائے تھے لیکن اروئی اس

کے ساتھ جانے کا سن کر مزید بھڑکی تھی، اسے یہ تھا وہ دونوں جیسے ہی باہر نکلیں گے میڈیا والے پھر سے کھبیوں کی طرح اکٹھے ہو جائیں گے، لہذا وہ ضد

کر کے عارفین کی بجائے اکیلی ہی واپس آئی تھی لیکن اسے یہ نہیں پتہ تھا کہ جن پہ مان ہو، وہی سب سے پہلے مان توڑتے ہیں۔



”دفع ہو جاؤ یہاں سے، میں تمہاری شکل نہیں دیکھنا چاہتی۔“ وہ مرے مرے قدموں سے گھر میں داخل ہوئی تھی لیکن امی نے دو ہتھ مارے ہوئے اسے صحن سے پیچھے دھکیل دیا تھا۔

”امی.....“ اروئی کی آواز کسی کنویں سے آتی محسوس ہوئی تھی۔

”مرگئی تمہاری امی، قتل کر دیا تم نے ہم سب کو، زندہ درگور کر دیا ہمیں کہیں منہ دکھانے کے لائق نہیں چھوڑا ہم کو۔ آج جگہ جگہ ہمارے گھر کی باتیں ہو رہی ہیں۔ خاک ڈالی ہے تم نے مرے ہوئے باپ کی عزت اور نام پر۔“ امی کا ایک ایک لفظ زہر میں بجھا ہوا تھا۔

”امی! پلیز میری بات تو سن لیں، پہلے مجھ سے تو کچھ پوچھ لیں۔“ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا تھا۔

”تم سے کیا پوچھوں، یہی کہ تو اتنا عرصہ اس شخص کے ساتھ رنگ رلیاں مناتی رہی ہے، ہمیں دھوکہ دیتی رہی ہے، اپنی حرام کی کمائی ہماری رگوں میں اتارتی رہی ہے، ایک شادی شدہ مرد کی.....“

”پلیز امی پلیز اللہ کے لئے ایسا کچھ مت کہیں، پہلے میری بات تو سن لیں۔ پلیز امی! ایسا کچھ نہیں ہے جو آپ سمجھ رہی ہیں۔“

”اچھا..... اچھا ابھی بھی ہم ہی سمجھ رہے ہیں، گویا ہمارا ہی قصور ہے؟ واہ کتنی دیدہ دلیری ہے میڈم کی؟“ ثمنینہ بھابی لپک کے میدان میں آئی تھیں۔

”بھابی پلیز میرا کسی کے ساتھ کوئی ناجائز تعلق نہیں ہے۔ ہمارا نکاح ہوا تھا، ہم نے شادی کی تھی۔“ اروئی کے صفائی دینے پہ ثمنینہ بھابی تمسخرانہ انداز میں قہقہہ لگا کر رہی تھیں۔

”یعنی چوری چوری نکاح بھی کر لیا اور ہمیں بتایا بھی نہیں؟ لگتا ہے بڑی جلدی تھی تمہیں شادی کی۔“ انہوں نے مزید طنز کے تیر چھوڑے تھے، اروئی چپ سی ہو گئی۔

”اونہہ..... خود نیک پاک باز بی بی دوسروں کے شوہروں کے ساتھ زنا کا کھیل کھیلتی پھر رہی ہے اور الزام دے رہی تھی میرے بھائی کو۔ اگر اتنا ہی شوق تھا کسی کے ساتھ ہوٹلوں میں..... گھلہ مرے اڑانے کا تو جبراً کو بتا دیتی، وہ آئے روز تمہیں ساتھ لئے پھرتا۔ ویسے کتنے عرصے سے دل بہلا رہی ہو عارفین شیرازی کا؟“ بھابی کے تیز نوکیلے جملے نے اس کا کلیجہ چھلنی کر ڈالا تھا، اس نے ڈبڈبائی آنکھوں سے ماں کی سمت دیکھا۔

”میں لعنت بھیجتی ہوں ایسی بے غیرت اولاد پہ جس نے پورے خاندان کا منہ کالا کر دیا ہے۔“ امی کہہ کے رخ موڑ گئی تھیں۔

”پلیز امی! ایک بار یہ تو دیکھ لیں کہ میرا قصور کہاں ہے؟“ وہ لپک کے ماں کے سامنے آئی تھی۔

”ہٹ جاؤ میری نظروں سے۔“ انہوں نے یکدم پورے زور سے تھپڑ اس کے چہرے پہ دے مارا تھا۔ بھابی کے سینے میں پھوار برسی تھی۔

”ثمنینہ..... سارہ..... اسے کہو ہمارے گھر سے اپنا گندہ غلیظ وجود لے کر نکل جائے۔“ امی آخری بار سفاکی سے کہتی ہوئیں اندر کمرے میں بند ہو گئیں۔ اروئی نے سب سے مایوس ہو کر آخری بار بہروز بھائی کے کندھے کا سہارا لیا تھا۔

”بھائی..... آپ..... آپ مجھے سمجھنے کی کوشش کریں، آپ..... آپ تو مجھ سے منہ نہ موڑیں..... آپ تو مجھے اپنی بیٹیوں کی طرح سمجھتے ہیں



نا؟ بھائی میں سچ کہہ رہی ہوں، مجھ پہ شک نہ کریں، میں بد چلن، بد کردار نہیں ہوں۔ میں نے کوئی بُرا کام نہیں کیا۔ عارفین شیرازی میرا شوہر ہے، نکاح کیا ہے اس نے مجھ سے۔“ وہ روتے ہوئے ان کا کندھا پکڑے کہہ رہی تھی۔

”کاش..... یہ سب سننے سے پہلے میں مر جاتا، کاش میں اس وقت ہی مر گیا ہوتا جب موت میرے سر پہ لنگ رہی تھی، میں یہ دن دیکھنے کے لئے کیوں زندہ بچ گیا۔“ بہروز بھائی اروڑی کا ہاتھ کندھے سے ہٹاتے ہوئے رو پڑے تھے اور اروڑی اُن کی بات سن کر ساکت ہو گئی تھی، اس کی ساری امیدیں پانی میں بہہ گئی تھیں، اس کے سارے مان ششے کی طرح ٹوٹ گئے تھے، اس کا سارا یقین ریت کی مانند کھر گیا تھا، وہ اتنے سارے اپنوں میں تنہا رہ گئی تھی، وہ اپنے ہی گھر میں اجنبیوں کی طرح کھڑی تھی، اس کے بھائی نے اس کا ہاتھ اپنے کندھے سے ہٹا دیا تھا۔ اس کی بہن اس سے دور خاموش تماشا بنی کھڑی تھی، اس کی ماں اس سے منہ پھیر کر اندر چلی گئی تھی اور اس کی بھابی اسے دھکا دے کر گھر سے نکالنے کے لئے تیار کھڑی تھی اور اب اتنا کچھ ہونے اور اتنا کچھ سننے کے بعد اس گھر میں اس کے لئے کیا بچا تھا؟ نفرت، حقارت اور بے رخی..... کیا وہ ان چیزوں کے ہوتے ہوئے اس گھر میں رہ سکتی تھی؟ ان لوگوں کے ساتھ پہلے کی طرح جی سکتی تھی؟ ہرگز نہیں..... گیا وقت کبھی لوٹ کے نہیں آتا، اسی طرح کسی کی نظروں سے گرنے والا اگر کرسنبھل نہیں پاتا، سو اروڑی حیات بھی اس گھر میں نہیں رہ سکتی تھی بلکہ اگر وہ رہنا چاہتی بھی تو اسے اس گھر میں کوئی بھی رکھنے پر آمادہ نہیں ہو سکتا تھا، لہذا اسے یہ گھر چھوڑنا ہی تھا اور اس نے یہ گھر چھوڑ دیا تھا، وہ چپکے سے سسکیاں بھرتی پلٹ پلٹ کر اپنے گھر کو اور گھر کے کینوں کو دیکھتی اس آس پہ دہلیز پار کر گئی کہ شاید اسے کوئی روک لے، شاید اس کا کوئی اپنا اس کا احساس کر بیٹھے مگر اس کی آس بھی اس طرح ٹوٹی تھی جیسے اس کا مان ٹوٹا تھا، نہ کسی نے اسے پکارا، نہ کسی نے اسے روکا تھا، وہ بہت خاموشی سے اپنے گھر اور گلی سے دور ہوتی چلی گئی تھی۔



نہ جانے کب سے وہ پیدل چل رہی تھی اور نہ جانے کب سے اس کا راستہ، اس کی مسافتیں طویل سے طویل تر ہوتی جا رہی تھیں، وہ ایک قدم بڑھتی تھی اور دس قدم پیچھے سرک جانے کا احساس ہوتا تھا۔ دکھ، بے بسی، تنہائی اور اذیت کے رنگ میں ڈھلی شام گہری ہوتی جا رہی تھی، اس کائنات کے کتنے ہی پنکھ پکھیر اپنے اپنے گھروں کو اپنے اپنے آشیانوں کو لوٹ رہے تھے اور ایک وہ تھی جو گھر سے ہی دور جا رہی تھی۔ کہاں جا رہی تھی؟ یہ ابھی تک اسے خود بھی پتہ نہیں تھا۔ بس قدم اٹھ رہے تھے اور وہ چل رہی تھی۔ چلتے چلتے وہ کہاں پہنچی اسے خود اندازہ نہ ہو سکا تھا لیکن چوکیدار اسے دیکھتے ہی پہچان گیا تھا۔

”سوری میم! صاحب تو گھر پہ نہیں ہیں۔“ اسے عارفین کے در پہ دستک دینا بھی نصیب نہیں ہوا تھا۔ ”کب آئیں گے؟“ اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ یہ سوال پوچھتی، بس سوالیہ نظروں سے دیکھ پائی تھی اور چوکیدار کا جواب سن کر مزید بے بس ہو گئی تھی۔

”کچھ پتہ نہیں میم! کب آئیں گے۔“ میرا تو خیال ہے کام ختم کر کے ہی آئیں گے۔ آپ کو جو کام ہے بتا دو، میں بتا دوں گا صاحب کو۔“

چوکیدار نے کافی عزت سے کہا تھا۔

”نہیں، کوئی کام نہیں ہے مجھے۔“ وہ نفی میں سر ہلاتی ہوئی دوپٹے سے چہرہ پونچھتی واپس مڑی، اتنے میں بے حد قریب ہی گاڑی کے ٹائر

چرچائے تھے۔

”اوہ مس اروئی حیات آئی ہیں؟“ زونکہ اور رابعہ شیرازی اسے دیکھتے ہی گاڑی سے اتر آئی تھیں۔ اروئی کے قدم ٹھک گئے تھے، یعنی ابھی اور اذیت کا بوجھ سہارنا تھا۔

”کیوں آئی ہو یہاں؟“ رابعہ شیرازی غرائی تھیں۔ ”مم..... میں ایک بار سر سے ملنا چاہتی ہوں۔“ اروئی میں اتنی سکت نہیں تھی کہ ان لوگوں کی بمباری کا سامنا یا پھر مقابلہ کر پاتی۔

”بے غیرت لڑکی تمہیں اتنی بھی شرم نہیں کہ جس شخص کے ساتھ پورے میڈیا کے سامنے رنگے ہاتھوں رنگ رلیاں مناتی اور منہ کالا کرتی ہوئی پکڑی گئی ہو، کم از کم ایک دودن اس شخص سے دور رہو۔ نہ جانے کس بے غیرت خاندان سے ہو۔ کیا تمہارے بھائی نے تمہیں حرام کرنے کے لئے پھر سے آزاد چھوڑ دیا ہے؟ تمہاری اس شریف عزت دار ماں نے بھی تمہیں عزت اور غیرت کا درس نہیں دیا؟ ہونہہ کنگال خاندان کی بکاؤ لڑکی۔ آخر چچا کیوں نہیں چھوڑ دیتی میرے بیٹے کا۔ اتنا کچھ پہلے لوٹ چکی ہو، اب کیا باقی ہے؟ عارفین کے ساتھ ہوٹل میں رات گزارنے کا کتنا معاوضہ لیا تھا کل رات؟ اگر اور پیسے کی ضرورت ہے تو آج کی رات ہمارے اس چوکیدار یا ڈرائیور کے ساتھ گزار لینا، پیسہ میں دے دوں گی۔ تمہارا بھی کام بن جائے گا اور ان بے چاروں کا بھی۔ وہ بھی جھڑے چھانٹ گھوم رہے ہیں۔“ اروئی پتھر کا بت تھی اور رابعہ شیرازی شعلے آگ کی بھٹی بنی ہوئی تھیں۔ وہ سوغلیظ الفاظ بول چکی تھیں اور وہ ایک گہری قیامت خیز چپ لئے کھڑی تھی۔

”آج تو میں تمہیں نظر انداز کر رہی ہوں مگر آئندہ تم شیرازی ہاؤس کے آس پاس بھی نظر آئیں تو اچھا نہیں ہوگا۔ ہونہہ مخوس نے اپنے ساتھ ساتھ ہمیں بھی بدنام کر کے رکھ دیا ہے لوگوں کے طرح طرح کے سوالوں کے جواب دینا پڑ رہے ہیں۔“ وہ کبھی جھکتی ہوئیں پھر سے گاڑی میں بیٹھ گئیں۔ چوکیدار نے ان کے اندر جانے کے لئے گیٹ کھول دیا تھا اور اروئی کسی رو بوٹ کی طرح چلتی ہوئی روڈ پہ آ گئی تھی۔ وہ مرے مرے قدموں کو گھسیٹتی بہت ہی آہستہ روی سے چل رہی تھی لیکن اتنا سب کچھ سننے کے بعد وہ بھلا اور کتنا چل سکتی تھی، اپنی تذلیل، اپنی جھک اور اپنا دکھ سوچتے ہوئے وہ بُری طرح چکرا گئی تھی اور اگلے ہی لمحے وہ لہرا کر سڑک کے پتھوں بیچ آ گری تھی اور انتہائی قریب آ جانے والی گاڑی کے بمشکل بریک لگے تھے اور پھر اس گاڑی سے ایک بے حد معزز اور پردہ دار خاتون بڑی تیزی سے باہر نکلی تھیں جنہوں نے اروئی کا سر قریب بیٹھتے ہوئے اپنی گود میں رکھ لیا تھا لیکن اس کا جسم بے جان سا ہو رہا تھا، لہذا اپنے ڈرائیور اور اپنی ایک خاص ملازمہ کی مدد سے اسے گاڑی میں ڈال کر ہسپتال لے گئی تھیں اور کچھ دور ہی عارفین اپنے گھر کے گیٹ کے سامنے ہارن دے رہا تھا۔ چوکیدار نے گیٹ کھولا تو وہ فوراً ہی گاڑی اندر لے آیا تھا، یہ جانے بغیر کہ باہر کچھ فاصلے پہ اروئی کو سڑک پہ بے ہوش چھوڑ آیا ہے اور اسے کون کہاں لے گیا ہے؟ یہ بھی خبر نہیں ہوئی تھی؟



وہ بہت دیر بعد ہوش میں آئی تھی لیکن ہوش میں آنے کے بعد وہ نہ جانے کتنی دیر خاموش پڑی ایک نلک ہسپتال کی چھت کو دیکھے گئی تھی اور ساتھ ہی ساکت نظروں سے آنسوؤں کا پانی بہتا رہا۔ رخسار ہیکے ہوئے تھے، پلکیں جڑی ہوئی تھیں، ہونٹ خاموش تھے اور زبان گنگ تھی لیکن پھر بھی



آنکھوں کا پانی ایسی جھیل بنا رہا تھا جس میں اروئی کے دکھ اس کی کم مائیگی صاف شفاف منظر کی طرح نظر آرہی تھی۔

”کیا بات ہے بیٹا، تم اتنی دیر سے روئے جا رہی ہو، کیا کوئی نقصان ہو گیا ہے تمہارا؟“ وہ خاتون بالآخر خود ہی اٹھ کر اس کے پاس آگئی تھیں۔

”میرا نقصان.....؟“ اس نے اس لفظ کو دہراتے ہوئے اپنے دل میں جھانکا تھا جو پہلے ہی نقصان زدہ تھا جس کے پاس کچھ نہیں رہا تھا جو خالی تھا بالکل خالی۔ خالی ہاتھ، خالی دامن، خالی دل اور خالی ذہن۔ نقصان کی دیواریں اس کے آس پاس سر بلند کھڑی تھیں اور وہ نقصان میں بال بال ڈوبا ہوا تھا۔

”بولونا بیٹا! کیا بات ہے، کیا ہوا ہے تمہارے ساتھ؟“ انہوں نے دوبارہ پوچھتے ہوئے اروئی کے کندھے پہ ہاتھ رکھ دیا تھا اور دوسرے ہاتھ سے اس کی پیشانی پر آئے بال پیچھے ہٹائے تھے۔

”کیا ہوا ہے میرے ساتھ؟“ اروئی زیر لب بڑبڑاتی تھی اور سوچ کے ساتھ ساتھ احساسات بھی بہت پیچھے چلے گئے تھے۔ زبان سے وہ کچھ نہیں بول پاتی تھی مگر ایک روانی سے بہتے آنسو خود غم کی داستان بنے ہوئے تھے۔ اروئی کا نقصان ایسا تھا جو وہ کسی کو سنا نہیں سکتی تھی، بس سوچ سوچ کر خود رو سکتی تھی، تڑپ سکتی تھی لیکن بیان نہیں کر سکتی تھی۔

نُرس میں، رت میں، ڈھول، تاشوں میں بٹ گئے  
ہم جیسے لوگ کھیل تماشوں میں بٹ گئے  
پھول سے چوٹ کھائی تو پتھر بنے جمیل  
پتھر بنے تو سنگ تراشوں میں بٹ گئے!



”بھائی پلیز پانچ منٹ، میں بس اس کارف لے لوں۔“ بہروز بھائی کو بائیک سٹارٹ کرتے دیکھ کر اروئی تیزی سے چائے کا کپ رکھ کر اندر کو بھاگی تھی کیونکہ اسے پتہ تھا کہ بہروز بھائی کو دروازے میں کھڑے ہو کر انتظار کرنے سے کتنی چڑا اور کتنی کوفت ہوتی ہے۔

”جلدی کرو اروئی!.....“ وہ گھڑی دیکھتے ہوئے بولے تھے۔ وہ فوراً ہی باہر نکل آئی تھی۔ امی نے دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا تھا۔ اروئی کے بیٹھے ہی انہوں نے بائیک آگے بڑھالی تھی۔

”پتہ نہیں بی بی کا یہ پڑھنا پڑھانا کب تک جاری رہے گا؟ بھابی منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی ہوئی سونیا کو فیڈر پلانے لگیں۔“

”دیکھو شمینہ! صبح صبح ہی ان کے گھر سے نکلتے ہی شروع نہ ہو جایا کرو۔ اپنے بھائی، اپنے ماں جائے کی کمائی پہ پڑھ رہی ہیں، تمہارے یا تمہارے گھر والوں کی کمائی پہ نہیں۔“ امی نے کبھی بھی یہ نہیں چاہا تھا کہ وہ اپنی بہو کے ساتھ روایتی ساس جیسا سلوک کریں لیکن ان کی بہو نہ جانے کیوں روایتی بہو بننے کے چکروں میں ہی رہتی تھی۔

”میرے شوہر کی کمائی تو ہے نا؟“ وہ تنک کے بولی تھیں۔

”تمہارا شوہر بعد میں پہلے وہ ان کا بھائی ہے۔“ امی نے بھی برجستہ جواب دیا تھا۔

”بھائی تو ہے، کیا اپنے بچوں کا باپ نہیں ہے؟ کل سے کہہ رہی ہوں سو نیا کا نیا فیڈ راور پمپر لانے..... ہیں لیکن انہیں خبر ہی نہیں ہے، ابھی

کوئی بہن کہہ دے گی کہ مجھے فلاں کتاب چاہئے، مجھے فلاں فیس دینی ہے تو فوراً اس چیز کے پیچھے لگ جائیں گے۔“

”ثمینہ کیوں ذرا ذرا سی بات پہ لڑائی جھگڑے کے بہانے ڈھونڈتی ہو، تم نے اسے کل ان چیزوں کا کہا تھا اور مجھے پتہ ہے آج وہ واپس پہ

سب کچھ لے آئے گا۔“ امی نے غصہ چھوڑ کر افسوس بھرے انداز میں کہا تھا لیکن ثمینہ بھائی کوئی بھی نوٹس لئے بغیر اندر چلی گئی تھیں۔



”صاحب جی! آپ کے بابا جان آئے ہیں، نیچے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔“ عارفین گہری پرسکون نیند سو رہا تھا، جب ملازمہ کے دستک

دے کر جگانے پہ فوراً اٹھ گیا تھا۔

”واہ آج سنڈے ہے، بابا جان نے اپنے آنے کا بتایا بھی تھا لیکن پھر بھی یاد نہیں رہا۔“ وہ ملازمہ کی موجودگی میں ہی بڑبڑاتا ہوا اپنے

آپ کو سرزنش کرتا ہوا تھروم میں گھس گیا تھا۔ ملازمہ پلٹ کر واپس چلی گئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ عجلت میں تیار ہو کر نیچے آ گیا تھا۔ بابا جان لاؤنج میں

بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔

”السلام علیکم بابا جان!“ اس نے اندر داخل ہوتے ہوئے بڑے جاندار سے انداز میں سلام کیا تھا۔

”والسلام بیٹا..... آؤ آؤ..... ڈسٹرب تو نہیں کیا ہم نے؟“ وہ اخبار رول کر کے ایک سائیڈ پہ رکھتے ہوئے بہت محبت پاش لہجے میں

بولے تھے۔

”ارے نہیں بابا جان! ڈسٹربنس کیسی۔ مجھے پتہ تھا آج آپ آنے والے ہیں لیکن کام کے دوران کچھ تھکن ہو گئی تھی، اس لئے گہری نیند

آئی تھی اور صبح اٹھنے کا ہوش ہی نہیں رہا۔“ وہ بابا جان سے مل کر ان کے برابر ہی صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔

”ہاں یار! یہ تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن یار! بیوی کے ہوتے ہوئے نہ تو بندے کو تھکن ہو سکتی ہے اور نہ گہری نیند آ سکتی ہے۔“ بابا جان نے

پہلی بار شاید اس کے ساتھ ایسا ذومعنی مذاق کیا تھا جس کو سمجھ کر عارفین یکدم قہقہہ لگا کر ہنسا تھا۔

”واہ گریٹ بابا جان! لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ بیوی آپ کے پاس ہو۔“

”کیوں، کہاں ہے زونکہ؟“ بابا جان نے چونک کر پوچھا تھا۔

”اس کے چچا زاد کن کی شادی ہے، وہ ماما کے ساتھ اسلام آباد گئی ہے۔“ عارفین نے کندھے اچکا کے کیونکہ وہ کبھی کسی اور طرح کی

باریکیوں میں نہیں گیا تھا یا پھر زونکہ جو ہے، جیسی ہے، وہ اسے ویسے ہی دیکھتا تھا۔ کبھی کھوجنے اور پرکھنے کے بارے میں سوچا ہی نہ تھا۔

”تمہاری شادی کو کتنا عرصہ ہو گیا ہے عارفین!“ اب کی بار بابا جان کا لہجہ کچھ دھیمّا اور ٹھہرا ہوا تھا اور لہجے میں ایک حسرت بسی ہوئی تھی۔



”تقریباً پانچ سال ہو گئے ہیں۔“ عارفین نے بھی کچھ ٹھہر کر ہی جواب دیا تھا کیونکہ وہ ان کے سوال کا مفہوم سمجھ چکا تھا۔

”عارفین! تم جوان ہو، تم دنیا کے ہنگاموں میں مصروف ہو، تم جاننے والوں اور ملنے والوں میں گم ہو لیکن ایک وقت وہ بھی آئے گا جب تم جوان نہیں رہو گے، جب دنیا کے ہنگاموں سے بے زار ہو جاؤ گے، جب ملنے ملانے والے آنکھیں پھیر لیں گے، تب تمہیں صرف ایک چیز کی کمی کا احساس ہوگا اولاد کا۔ اولاد انسان کا سرمایہ ہوتی ہے، پوری زندگی کی جمع پونجی..... اور تم جانتے ہو انسان کا سرمایہ پھر جمع پونجی مشکل وقت میں ہی کام آتی ہیں اور اگر کام نہ بھی آئے، دل کو تو سکون دے ہی سکتی ہے نا؟ اور پھر سب سے بڑھ کر جو اہم چیز ہے کہ تمہاری اولاد تمہارا نام زندہ رکھتی ہے، تمہاری نسل قائم رہتی ہے۔ بیٹا میری اولاد میرا بیٹا نہیں بن سکا لیکن مجھے اپنی جمع پونجی پہ ابھی بھی بڑا مان ہے۔ مجھے پتہ ہے وہ نہیں تم تو ہو۔ تم تو میرے ہی بنو گے نا؟ اور تمہارے حوالے سے بس یہی خواہش ہے کہ تم جلد سے جلد صاحب اولاد ہو جاؤ۔ بیٹا اللہ کے لئے اپنا نہیں تو ہمارا ہی کچھ خیال کر لو، ہم اپنے ویران گلشن میں بہار چاہتے ہیں اور اس بہار کی بنیاد تم رکھ سکتے ہو صرف تم۔ بیٹا! ہم زندگی میں بہت سے دکھ بہت سے دھچکے سہہ چکے ہیں، اب کچھ اور سہنے کی ہمت اور سکت نہیں ہے۔ تمہاری بیوی آج کل کی ماڈرن بیوی ہے، وہ کبھی بھی خود سے اس چیز کی کمی کا اظہار کرے گی نہ ہی احساس کرے گی۔ ہماری خوشیوں اور اپنی نسل اور نام کے متعلق تمہیں خود سوچنا ہوگا، اگر وہ بیمار ہے تو اس کا کسی ماہر لیڈی ڈاکٹر سے علاج کرواؤ اور اگر ٹھیک ہے تو اسے اس چیز کی طرف مائل کرو۔“ بابا جان اور بی بی جان اکثر اپنی یہ خواہش ڈھکے چھپے الفاظ میں بیان کرتے رہتے تھے لیکن عارفین نے کبھی خاص طور پر اس چیز کی طرف دھیان نہیں دیا تھا لیکن اب اسے کچھ عرصہ سے سچ سچ ان کی خواہش ان کی بات کا احساس ذرا گہرائی سے ہونے لگا تھا اور اس نے زونکہ سے ذکر بھی کیا تھا مگر زونکہ نے بات ٹال دی اور زونکہ اکثر بے حد اہم کام بھی اگنور کر جاتی تھی، صرف اپنی (خالہ) رابعہ شیرازی کی شہمہ پہ..... کیونکہ اسے پتہ تھا کہ میرے اچھے برے کی پشت پناہی کرنے کے لئے وہ موجود ہیں۔

”جی بابا جان! آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں لیکن سب سے پہلے تو اللہ سے دعا کیجئے کہ وہ آپ کی اور میری خواہش پوری کرے اور ہماری دعا قبول کرے۔“ عارفین نے انہیں تسلی دی تھی اور وہ بہت خوش ہوئے تھے۔

”جیسے رہو بیٹا! اللہ تمہارا نام و نشان سلامت رکھے، آباد رکھے۔“ انہوں نے اس کے کندھے پہ تھپکی دی تھی۔  
 ”خیر آپ سنائیں لٹچ میں کیا لیس گے۔“ عارفین نے ٹائم دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔  
 ”آج ہم دادا، پوتا لٹچ باہر کریں گے۔“ بابا جان نے خوشگوار موڈ میں کہا تھا۔

”اوہ لگتا ہے آج بی بی جان نے بہت اچھے موڈ میں رخصت کیا تھا آپ کو۔“ اس نے چھیڑا تھا ان کو، جواباً وہ قہقہہ لگا کر ہنستے ہوئے۔  
 کھڑے ہو گئے تھے اور عارفین بھی ان کے ساتھ ہی باہر آ گیا تھا۔

”بی بی جان اور مہر النساء! آئی کیسی ہیں؟“ اس نے گاڑی نکالتے ہوئے سب کا حال چال پوچھا تھا۔  
 ”اللہ کا شکر ہے تمہاری بی بی جان تو ٹھیک ہیں لیکن مہر النساء بہت دنوں سے بیمار ہے۔ پہلے بخار ہو گیا پھر کمزور اور نقاہت کی وجہ سے اس کا بی بی لور بننے لگا ہے اور بے چاری کی دونوں پچیاں ماں کے لئے بے حد پریشان ہیں۔ اللہ ان کے بھی نیک نصیب کرے۔ مہر النساء بیٹیوں کی طرف سے بھی

بہت فکر مند رہتی ہے، ہم نے تو بہت کوشش کی تھی لیکن.....“ بابا جان ادھوری بات چھوڑتے ہوئے چپ سے ہو گئے تھے اور عارفین بھی خاموش ہو گیا۔ وہ بھی کچھ نہ کہہ سکا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ بابا جان کی خواہش کیا تھی؟ وہ شروع سے ہی عارفین کی شادی مہر النساء کی بیٹی سے کرنا چاہتے تھے لیکن رابعہ شیرازی کو مہر النساء کی بیٹی کا سن کر آگ لگ گئی تھی۔ انہوں نے نے عارفین کو سختی سے منع کر دیا تھا کہ وہ مجھ سے پوچھے بغیر شادی کی ہاں نہ بھرے۔ اس کی شادی اس کی خالد زاکرن زونملہ کے ساتھ طے ہو چکی ہے۔ زونملہ اچھی تھی، خوبصورت تھی، ماڈرن اور پڑھی لکھی تھی لیکن اس سب کے باوجود ان دونوں میں انڈر سٹینڈنگ نہیں تھی۔ کوئی پھل مچانے والا، کوئی بے چین کرنے والا جذبہ نہیں تھا وہ صرف کزن تھے اور کزن سے آگے کچھ نہیں تھے لیکن رابعہ شیرازی انہیں کزن کے رشتے سے بہت آگے لے آئی تھیں۔ انہوں نے عارفین سے اور بابا جان سے کچھ بھی پوچھے بغیر اس کی انگیج منٹ کا اعلان کر دیا تھا اور وہ لوگ بس دیکھتے رہ گئے تھے۔ مہمانوں کو بھی انوائٹ کیا جا چکا تھا، لہذا عارفین کے اعتراض کرنے کے یا کچھ کہنے کے تمام چانسز ختم ہو چکے تھے۔ البتہ بابا جان اور رابعہ شیرازی آپس میں خوب گرم ہوئے تھے۔

”ہمارے پوتے کی شادی تم ہم سے پوچھے بغیر ہم سے اجازت لئے بغیر کیسے طے کر سکتی ہو؟“ بابا جان کی آواز غصے سے لرز رہی تھی اور آنکھیں شعلے اگل رہی تھیں۔

”وہ آپ کا پوتا ہی نہیں، میرا بیٹا بھی ہے۔ میں اس کی زندگی کے حوالے سے جو چاہے طے کر سکتی ہوں۔“ رابعہ شیرازی کا لہجہ بھی کافی گرمی لئے ہوئے تھا، آواز بہت بلند تھی۔

”کس چیز کے بل بوتے پہ ایسا کر سکتی ہو؟ ہم اگر چاہیں تو ابھی کھڑے کھڑے تمہیں تمہاری اوقات دکھا سکتے ہیں۔ تم اگر ابھی تک ہماری بہو کے نام سے پہچانی جا رہی ہو تو صرف اس کی وجہ سے..... ہمیں اپنے پوتے کی وجہ سے تمہیں برداشت کرنا پڑ رہا ہے، ہم صرف اپنے بیٹے کی اولاد کی خاطر تمہیں جھیل رہے ہیں ورنہ تم نے کونسا سکون دیا تھا ہمارے بیٹے کو جو تم ہمیں بھی دو گی؟“ بابا جان نہ جانے کب سے بھرے بیٹھے تھے فوراً غصے میں سب کچھ کہہ گئے تھے۔ رابعہ شیرازی پل میں خشکی تھیں لیکن پل میں سنبھل بھی گئی تھیں۔

”آپ کا بیٹا کہیں مر کھپ گیا ہے تو اس میں، میں کیا کر سکتی ہوں؟ اور آپ مجھے جھیلنے کا احسان مت کریں، میں آج بھی یہ گھر چھوڑ کر جا سکتی ہوں۔ آپ اپنا پوتا اپنے پاس رکھیں۔“ رابعہ شیرازی ہمیشہ جیسے ایسوشل ہتھیاروں پہ اترا آئی تھیں اور عارفین گھبرا گیا تھا۔ وہ بچپن سے باپ کی گمنامی کا صدمہ سہتا آ رہا تھا۔ اب ماں کی ناراضی نہیں سہہ سکتا تھا، لہذا بابا جان کو ٹھنڈا کرنے کے بعد رابعہ شیرازی کو جانے سے روکا تھا، چونکہ مہمان وغیرہ انوائٹڈ تھے۔ ساری تیاریاں مکمل تھیں، اس لئے بابا جان کی خشکی کے باوجود انگیج منٹ ہو گئی تھی اور تین ماہ بعد شادی کا اعلان بھی کر دیا گیا تھا۔ رابعہ شیرازی نے شادی اور انگیج منٹ میں سب کو انوائٹ کیا تھا، سوائے مہر النساء کے۔ مہر النساء رابعہ شیرازی کے سینے میں گولی کی طرح لگتی تھیں، ان کا نام ہی رابعہ شیرازی کو آگ لگا کے رکھ جاتا تھا۔ حالانکہ مہر النساء نے کبھی اس کے بارے میں برا نہیں سوچا تھا، وہ ہمیشہ انہیں ”رابعہ باجی“ یا پھر ”رابعہ بہن“ ہی کہہ کر بلاتی تھیں لیکن ”رابعہ بہن“ ہر لمحے انگارے چبائے رکھتی تھیں اور دونوں کی شخصیت کا موازنہ کرتے کرتے عارفین پہ ادراک ہوا تھا کہ مہر النساء آنٹی کے سامنے اس کی ماں کچھ بھی نہیں ہے۔



”کہاں کھوئے ہو پتر جی! ہم ٹوٹل آچکے ہیں۔“ بابا جان نے عارفین کو کسی سوچ میں محو دیکھ کر متوجہ کیا تھا۔

”جی بابا جان! آئیے۔“ وہ چوکتے ہوئے فوراً ہی حواسوں میں لوٹ آیا تھا اور بابا جان کے ساتھ لہجہ کرتے ہوئے باتوں کے دوران اسے یہ بھی یاد نہ رہا کہ وہ تھوڑی دیر پہلے کیا کچھ سوچ رہا تھا؟

<http://kitaabghar.com>

”بہروز تم سے بات کرنا تھی بیٹا۔“ بہروز بھائی نہا کر باہر نکلے تو امی نے انہیں پاس بلا لیا تھا۔

”جی امی! کہئے کیا بات کرنا تھی؟“ وہ اپنی قمیص کے بٹن بند کرتے ہوئے امی کے قریب ہی برآمدے میں رکھی کرسی پہ بیٹھ گئے تھے۔

”وہ یسری کے سسرال والے شادی کرنا چاہ رہے ہیں، نکاح تو پہلے ہی ہو چکا ہے، اس لئے ہم زیادہ انکار بھی نہیں کر سکتے، بُرا لگے گا اس طرح۔“ امی شش و پنج میں مبتلا تھیں لیکن بہروز بھائی ریلیکس ہی تھے۔

”انکار کرنا بھی کیوں ہے امی! ہم ابھی سے شادی کی تیاریاں شروع کر لیتے ہیں۔“

”لیکن بیٹا شادی کے لیے اتنی رقم؟“ وہ جس چیز کے لیے فکر مند تھیں، انہوں نے کہہ ہی دیا تھا، انہیں پتا تھا ان کا صرف ایک ہی بیٹا ہے اور اس پہ پورے گھر کے ساتھ ساتھ تین بہنوں کا بھی بوجھ ہے اور اب تو بہنوں کے ساتھ اس کی اپنی بیٹی بھی اس کی ذمہ داریوں میں اضافہ کر چکی تھی۔

”امی سب کچھ بھول کر صرف اللہ پہ بھروسہ رکھیں، وہ سب اچھا کرے گا۔ آپ رقم کی فکر نہ کریں، میں کافی عرصہ سے یسری کے لئے کچھ نہ کچھ بچا رہا تھا۔ کل ہی آپ کو بینک سے وہ رقم لا دوں گا، اگر اور ضرورت پڑی تو اپنے پاس سے کچھ رقم ایڈوانس لے لوں گا۔ یسری کے فرض سے فارغ ہو جائیں تو پھر انشاء اللہ ارونی کے لئے سوچنا شروع کر دوں گا۔ باری باری سب کو ان کا لکھا مل ہی جائے گا۔“ بہروز بھائی نے امی کی پریشانی بیٹھے بیٹھے حل کر ڈالی تھی۔ انہوں نے بے اختیار اپنے اتنے اچھے سعادت مند اور سمجھ دار بیٹے کا ماتھا چوم لیا تھا اور پھر اگلے ہی روز انہوں نے رقم لا کر ماں کے ہاتھ پہ رکھ دی تھی۔ شادی کے لئے چھوٹے موٹے جہیز اور ضروری اشیاء کی شاپنگ شروع ہو گئی تھی۔ یسری تو شرمائی رہتی تھی، البتہ ارونی اور سارہ خوب انجوائے کر رہی تھیں۔ انہوں نے رفتہ رفتہ سب کچھ کمپلیٹ کر لیا تھا۔ بس اپنی شاپنگ رہ گئی اور وہ بھی اس لئے رہ گئی تھی کہ وہ لوگ فرصت سے یہ کام کرنا چاہتی تھیں۔



”میں فی الحال بچے نہیں چاہتی۔“ عارفین نے پہلے بار اس چیز کا واضح اظہار کیا تھا۔ لیکن زوملہ نے فوراً انکار تھا دیا تھا۔

”لیکن میں چاہتا ہوں ہماری شادی کو پانچ سال ہو چکے ہیں زوملہ اور کتنا انتظار کروں، کیا تمہیں خود اس کی کا احساس نہیں ہوتا؟“ عارفین، زوملہ کے سامنے آکھڑا ہوا تھا۔

”کی کیسی عارفین! تم اپنی زندگی میں خوش ہو، مگن ہو، میں اپنی زندگی میں خوش ہوں۔ پھر کسی کس چیز کی ہوئی بھلا؟ یہ بچوں کے لئے تو زندگی پڑی ہے، ابھی سے کیوں اپنا اتنا خوبصورت فگر خراب کر لوں؟“ زوملہ نے اپنے سراپے کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

”تمہیں فکر خراب ہونے کی فکر ہے، لیکن ہماری زندگی خراب ہونے کی فکریں ہیں؟ اولاد انسان کے لئے نام ہوتی ہے، نشان ہوتی ہے، آئندہ کی نسل اور اپنے دل کے لئے سکون ہوتی ہے۔۔۔۔۔ کہتے ہیں عورت ماں بننے کے بعد ہی مکمل عورت بنتی ہے۔ کیا تم نہیں چاہتیں کہ تمہاری ذات بھی مکمل ہو؟“ عارفین آج دلائل سے پیش آرہا تھا۔

”یہ بس دقیانوسی باتیں ہیں، میں نہیں مانتی ان چیزوں کو آج کل کے دور میں کوئی چیز ضروری نہیں ہے، بس انسان کی اپنی ذات ہی اپنے لئے کافی ہے۔“ زونکہ کی بات پہ عارفین چند لمحے چپ چاپ اسے دیکھتا رہا تھا۔ ”میں ڈاکٹر فائزہ سے کل کے لئے ٹائم لے چکا ہوں، تمہیں کل میرے ساتھ چلنا ہوگا۔“ وہ اس کو تکرار کرے سے باہر نکل آیا تھا، لیکن زونکہ بھی اس کے پیچھے پیچھے ہی کمرے سے باہر آگئی تھی۔

”مام دیکھئے ناعارفین کیا کہہ رہے ہیں؟“ زونکہ رابعہ شیرازی کے بازو سے جا لگی تھی۔

”کیا کہہ رہا ہے عارفین؟“ انہوں نے لاڈ سے بھانجی کے بال سنوارے۔

”یہ ڈاکٹر سے ٹائم لے کر آئے ہیں، انہیں بچوں کی ضرورت ہے۔ لیکن مام میں ابھی سے بچے نہیں چاہتی، میری ساری خوبصورتی ماند پڑ جائے گی، میرا فکر بھی خراب ہو جائے گا، پلیز مام؟“

”زونکہ تم خواہو بات کو بڑھا رہی ہو۔“ عارفین کو غصہ آیا تھا۔

”عارفین میری جان کیوں اتنے روڈ ہو رہے ہو؟ وہ اگر بچے نہیں چاہتی تو تم بھی ضد نہ کرو۔“

”مام آپ بھی اس بات کو گہرائی سے نہیں لے رہیں؟ کم از کم آپ کو تو کچھ سوچنا چاہئے؟“ عارفین کوچ کوچ ماں کے انداز اور لا پرواہی پہ حیرت ہوئی تھی، ورنہ بہت سی مائیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو بیٹے کی اولاد کے لئے منتیں، مرادیں مانتے ہوئے نہیں تھکتیں، بلکہ پوتے، پوتی کی خواہش میں سکون سے سوتی بھی نہیں ہیں، جبکہ رابعہ شیرازی۔۔۔۔۔؟ وہ کوچ کوچ صرف رابعہ شیرازی ہی تھیں، نہ وہ کسی کی بیوی تھیں، نہ وہ کسی کی ماں تھیں، نہ وہ کسی کی بہو، بیٹی تھیں، وہ صرف ”رابعہ شیرازی“ تھیں، اپنی ذات کے لئے اپنے آپ کے لئے بس۔

”تمہاری ماں اور تمہاری بیوی چاہے کچھ بھی نہ سوچیں، لیکن ہم نے بہت کچھ سوچ لیا ہے بیٹا۔“ بابا جان جو ریلنگ کے قریب کھڑے ان کی باتیں سن رہے تھے، بہت پر اسرار سے انداز میں کہتے نیچے اتر آئے تھے۔

”کیا مطلب ہے بابا جان؟“ عارفین چونک گیا تھا۔

”مطلب صاف ظاہر ہے بیٹا تمہاری بیوی اگر تمہیں اولاد جیسی خوشی دیتی ہے تو ٹھیک، ورنہ بچوں کے لئے تمہیں دوسری شادی کرنا ہوگی اور تمہاری دوسری شادی ہم خود کروائیں گے اپنی مرضی سے۔“ بابا جان نے کھڑے کھڑے حقیقتان لوگوں پہ ہم پھوڑ دیا تھا، رابعہ شیرازی اور زونکہ شیرازی تو دور کی بات خود عارفین بھی چکر اکر رہ گیا تھا۔ اس نے حیرت سے انہیں دیکھا تھا۔

”ہاں۔ بیٹا لوگ اپنی نسل، اپنے نام کے لئے کچھ بھی کر لیتے ہیں تم کوئی انوکھا کام نہیں کرو گے۔ البتہ اپنی ماں اور بیوی سے کہو وہ ایک بار پھر سوچ لیں۔“ بابا جان فیصلہ کن انداز میں کہہ کر آگے بڑھ گئے۔



”ایسا کبھی نہیں ہوگا میری بھانجی پہ سوتن نہیں آسکتی۔“ رابعہ شیرازی چھنکار کے بولی تھیں اور بابا جان دوبارہ واپس پلٹ آئے تھے۔

”میں اپنے اسی پوتے کی قسم کھاتا ہوں رابعہ بی بی اگر تمہاری بھانجی نے بچہ پیدا نہ کیا تو اس پہ سوتن ضرور آئے گی اور تم خود اپنی بھانجی کی سوتن کو بیاہ کے لاؤ گی۔ بس میری یہ قسم یاد رکھنا۔“ وہ اپنے فیصلے پہ قسم جیسی آخری کیل ٹھوک کر وہاں سے چلے گئے تھے اور رابعہ شیرازی پہلی بار..... دم بخود رہ گئی تھیں۔ بابا جان بہت نرم تھے تو بہت سخت بھی تھے۔ کوئی ان کے سامنے پر نہیں مار سکتا تھا۔ فقط رابعہ شیرازی ایسی تھیں جو ان سے دبدو بات کرتی تھیں اور ان کی چپ کا ناجائز فائدہ اٹھاتی تھیں۔ مگر آج.....

”اروئی آپ کی آپ کس کمر کا سوٹ لیں گی، یسری آپ کی مایوں کے لئے؟“ ٹیکسی سے اترتے ہی سارہ کو سوٹ کے کلر کی فکر شروع ہو گئی تھی۔ ”ابھی شاپ کے اندر تو جا لینے دو۔“ اروئی نے خفگی سے گھورا تھا اسے۔

”امی شاپنگ کے بعد آئس کریم کھلائیں گی نا؟“ اب سارہ کی توپ کا رخ امی کی سمت ہو چکا تھا۔ اروئی کی نہ چاہتے ہوئے بھی ہنسی پھوٹ نکلی تھی۔ وہ بے حد کھلکھلا کے ہنسی تھی اور ذرا سے فاصلے پہ گاڑی سے اترتے عارفین شیرازی نے چونک کر ہنسی کے تعاقب میں دیکھا تھا، آف وائٹ اور پر پل کبھی نیشن کے پرنٹڈ سوٹ میں ملبوس پرکشش شخصیت کی حامل وہ لڑکی بہت دلکشی سے مسکرا رہی تھی اور اس کی نظروں کا مرکز اپنے ساتھ کھڑی دوسری لڑکی تھی۔ عارفین ان لوگوں کی ٹوک جھوک سنتا ہوا سائیڈ سے گزر کر آگے بڑھ گیا تھا، البتہ شاپنگ سنٹر میں جانے سے پہلے اس نے ایک بار پھر ان لوگوں کو دیکھا تھا اور مسکرا کر اندر چلا گیا، لگتا تھا وہ لوگ کافی فرصت اور فریش موڈ سے آئی تھیں، لیکن عارفین کو نہیں پتہ تھا کہ ان کی یہی بے فکری اور فریش موڈ وہ خود ہی ختم کر بیٹھے گا۔ وہ پہلے شاپنگ کرنے کے بعد اپنے ایک جاننے والے کے ساتھ ہی قریبی ریسٹورنٹ چلا آیا تھا اور انہیں لچ کروانے کے بعد وہاں سے رخصت چاہی تھی، پارکنگ ایریا سے اس نے گاڑی بہت آہستہ رفتار میں نکالی تھی اور پھر روڈ پہ آ کر اس نے یوٹرن بھی بہت ہی سلور رفتار میں لیا تھا۔ یوٹرن لیتے ہی اس نے گاڑی کی سپیڈ ایک دم سے بڑھا دی تھی اور گاڑی کو سلور رفتار میں آتا دیکھ کر فٹ پاتھ سے اتر آنے والی سارہ یقیناً گاڑی کا نشانہ بنتی، اگر یک دم اروئی اسے دھکا نہ دے دیتی۔ سارہ تو ایک سائیڈ پہ گرنے کی وجہ سے بچ گئی تھی، لیکن اروئی کی چیخ نے پورے ماحول کو منتشر کر کے رکھ دیا تھا، اس کا دوپٹہ گاڑی کے نائرس سے لپٹ کر اسے بھی زمین بوس کر گیا تھا اور عارفین بریک لگاتے ہوئے فوراً ہی بھاگتے ہوئے پاس آیا تھا۔

”اروئی آپ کی؟“ سارہ زمین پہ بہتا خون دیکھ کر پاگل ہوا ہنسی تھی۔ امی دوزانو اس کے قریب گرنے کے سے انداز میں بیٹھی تھیں اور اروئی کی بند ہوتی آنکھوں نے تین چہرے اپنے بے حد قریب جھکے دیکھے تھے۔ سارہ کا چہرہ، امی کا چہرہ، اور ایک اجنبی (عارفین شیرازی) کا چہرہ وہ چہرہ بھی اتنا ہی متفکر اور ہوائیاں اڑاتا نظر آ رہا تھا جتنے باقی دو چہرے، اور اس کی بند ہوتی بے ہوشی میں ڈوبتی آنکھوں میں وہ چہرہ بھی ”ڈوب“ گیا تھا۔ کہنے کو صرف چہرہ ڈوبا تھا، لیکن صحیح معنوں میں بہت کچھ ڈوب چکا تھا، اس کی بند ہوتی آنکھوں نے بہت کچھ اپنے اندر ہی قید کر لیا تھا، لیکن وقتی طور پر خاص محسوس نہیں ہو سکا تھا۔

”اروئی..... اروئی“ وہ ماں، بیٹی بے تحاشا روتے ہوئے پکارے جا رہی تھیں، آس پاس لوگوں کا شور اور جھوم بڑھ چکا تھا، ان لوگوں کی بڑے

ارمانوں اور خوشیوں سے خریدی چیزیں سڑک پہ بکھری تھیں، عارفین نے مجرموں کی طرح سر جھٹک کر اسے اٹھایا اور اپنی گاڑی میں ڈالا تھا، سارہ اور امی بھی اس کے ساتھ ساتھ تھیں، وہ بڑی تیزی اور عجلت میں ڈرائیو کرتا ہسپتال پہنچا تھا۔



تقریباً ایک گھنٹے کے بعد وہ مکمل ہوش میں آئی تھی۔ سیدھا سڑک پہ گرنے کی وجہ سے اس کا سر بری طرح زخمی ہوا تھا اور خون بھی کافی زیادہ بہا تھا۔ اندر ہی اندر عارفین بہت زیادہ پشیمانی کا شکار ہو رہا تھا۔ حالانکہ غلطی سراسر اروئی اور سارہ کی تھی وہ تو بالکل صحیح سپید سے ڈرائیو کر رہا تھا۔ ”سر آپ کی پیشدہت ہوش میں آچکی ہیں اور وہ گھر جانا چاہتی ہیں۔“ وہ کوریڈور میں ریسپشن کے قریب ٹھلٹے ہوئے مسلسل چکر کاٹ رہا تھا۔ اس کا دھیان زونک کی طرف تھا، اس کو لے کر ڈاکٹر فائزہ کے پاس جانا تھا، لیکن وہ کافی لیٹ ہو چکا تھا۔ نرس کے بتانے پر وہ اندر آ گیا تھا، جہاں وہ تینوں خواتین موجود تھیں اور زخمی ہونے والی ”اروئی“ نامی لڑکی پورے ہوش و حواس میں نظر آرہی تھی۔ عارفین نے دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کیا تھا کہ کوئی لمبی چوڑی مصیبت کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ اگر اس لڑکی کی چوٹ گہری ہوتی تو زیادہ مشکل ہو سکتی تھی۔

”جی ماں جی اب کیسی کنڈیشن ہے ان کی؟“ عارفین نے بہت ہی عزت اور احترام سے مخاطب کیا تھا انہیں اور اروئی کی طبیعت پوچھی تھی۔ امی بھی اچھی طرح جان چکی تھیں کہ وہ ایک انتہائی شریف اور سلجھا ہوا انسان ہے۔ بے شک دیکھنے سے ہی امیر کیر لگ رہا ہے، لیکن اس کے کسی بھی انداز و اطوار سے عام بگڑے ہوئے امیر زادوں جیسی کوئی جھلک نظر نہیں آرہی تھیں۔

”بیٹا یہ اب ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ یہ اب گھر جاسکتی ہے۔“ امی نے فوراً بتایا تھا۔

”اگر آپ گھر جانے کے لئے رضامندی ہیں تو ٹھیک ہے میں آپ لوگوں کو ڈراپ کر دیتا ہوں، اور اگر آپ مطمئن نہیں اپنے آپ کو صحیح فیل نہیں کر رہے ہیں تو کوئی بات نہیں آپ مزید یہاں ایڈمٹ رہ سکتی ہیں میں ڈاکٹر صاحب سے بات کر کے آپ کا ٹریٹ منٹ بڑھا دیتا ہوں۔“

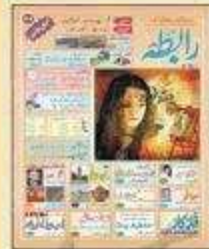
”نہیں، سر میں بالکل ٹھیک ہوں، میں گھر جانا چاہتی ہوں۔“ اروئی نے اس کی بات سنتے ہی انکار کر دیا تھا اور فوراً ہی بیڈ سے کھڑی ہو گئی تھی، مگر دماغ یک دم چکر کر رہ گیا تھا اور قدم لڑکھڑا گئے تھے۔ سارہ نے یک دم اسے کندھے سے تھام لیا تھا۔

”اٹس اوکے۔“ اروئی نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش تھی اور پھر سارہ کے ساتھ چلتے ہوئے وہ باہر پارکنگ تک آئی تھی۔ عارفین نے انہیں ڈراپ کرنے کی ذمہ داری خود لی تھی۔ حالانکہ اروئی نے منع کیا تھا وہ کسی اجنبی کا احسان نہیں لینا چاہتی تھی اور نہ ہی اسے گھر تک لے کر جانا چاہتی تھی، مگر جب امی کو اعتراض نہیں تھا تو وہ بھلا کیا کرتی؟ نہ جانے کیا بات تھی کہ نہ چاہتے ہوئے بھی عارفین نے اس لڑکی (اروئی) کو دو بار بیک و فورمر سے دیکھا تھا۔ دیکھنے میں وہ لڑکی بہت چمکی تھی، لیکن جاننے اور سمجھنے میں وہ بہت نرم محسوس ہو رہی تھی، اس کی شخصیت دو رنگوں کا امتزاج لئے ہوئے تھی، نرمی کا رنگ بھی اور سختی کا رنگ بھی۔

”جی بس یہیں ڈراپ کر دیں؟“ امی اور عارفین بے وجہی باتوں میں مصروف تھے، سارہ سبھی بیٹھی تھی، اروئی نے خود ہی اسے چونکا کے بریک لگانے کو کہا تھا۔



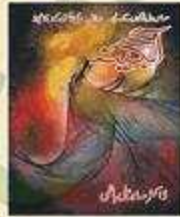
”ماں جی یہ میرا کارڈ ہے آپ کو زندگی میں کبھی بھی کسی کام کی کسی چیز کی ضرورت پڑے آپ مجھے یاد کر سکتی ہیں اور مجھے آپ کی خدمت کر کے خوشی ہوگی؟“ گاڑی سے اترنے سے پہلے عارفین نے امی کو اپنا کارڈ تھمایا تھا اور وہ کارڈ امی نے گھر آ کر اپنی سلائی مشین کی دراز میں ڈال دیا تھا۔



ہمارا عزم..... فروغِ اردو  
معیاری کتب کی اشاعت کا با اعتماد ادارہ

## قلمکار کلب پاکستان

آپ شاعر ہیں یا کہانیاں لکھنے کا شوق ہے؟



..... تو .....

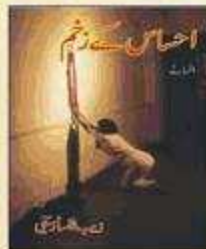
اپنی تحریروں کو دیدہ زیب و دلکش انداز میں کتابی شکل میں شائع کروانے کے لیے ہم سے رابطہ کریں۔

ہم کمپوزنگ، پروف ریڈنگ اور ٹائپنگ ڈیزائننگ سے لے کر کتاب کی اشاعت تک تمام مراحل کا اہتمام کرتے ہیں۔



مزید معلومات کے لیے رابطہ کریں۔

ڈاکٹر صابر علی ہاشمی 0333 222 1689



qalamkar\_club@yahoo.com

”کہاں تھے تم، زونکہ کب سے تمہارا انتظار کر رہی ہے، تم نے اسے ڈاکٹر کے پاس لے کر جانا تھا؟“ رابعہ شیرازی، عارفین کو دیکھتے ہی شروع ہو گئی تھیں، جبکہ وہ کافی تھکا ہوا لگ رہا تھا۔

”مام میں گھر ہی آ رہا تھا لیکن راستے میں معمولی سا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ ایک لڑکی زخمی ہو گئی تھی، اس لئے ان لوگوں کے ساتھ ہسپتال جانا پڑ گیا تھا۔“ اس نے صوفے پہ نیم دراز ہوتے ہوئے بتایا تھا۔

”زیادہ نقصان تو نہیں ہوا؟“

”نہیں کافی حد تک بچت ہو گئی تھی۔“

”تم خود تو ٹھیک ہونا؟“ رابعہ شیرازی آج سچ مچ ایک ماں کا روپ دھارے ہوئے تھیں، جن کو بیٹے کی بھی فکر ہو رہی تھی اور بہو کے علاج کے لئے بھی پریشان تھیں اور یہ سب کرم نوازی بابا جان کی آخری وارنگ ان کی قسم کی وجہ سے ہو رہا تھا، اب رابعہ شیرازی کو اپنی لاپرواہیاں چھوڑ کے عملی زندگی میں آنا تھا، اب انہیں یہ فکر تھی کہ زونکہ جلد سے جلد ماں بنے اور وہ پھر سے بے فکری ہو کر اپنی راجدھانی پہ پیش کریں۔

”جی میں ٹھیک ہوں۔“ عارفین بھی اپنی ماں کا بدلا ہوا رنگ روپ بھانپ گیا تھا اور دل ہی دل میں اس نے بابا کو داد دی تھی، جن کی ایک دھمکی ہی اتنی پر اثر ثابت ہوئی تھی کہ رابعہ شیرازی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے نئی فکروں میں لگ گئی تھیں۔

”پھر زونکہ کو کب لے کر جاؤ گے؟“ وہ گھوم پھر کے دوبارہ اپنے مطلب کی بات پہ آ گئی تھیں۔

”شام کو ڈاکٹر فائزہ سے بات کروں گا، جب انہوں نے کہا تب لے جاؤں گا۔“ عارفین کا ذہن کچھ منتشر ہو رہا تھا، اس لئے ان کی باتوں پہ دھیان ذرا کم ہی دے رہا تھا۔

”اوکے، لیکن یاد سے بات کرنا، بعد میں نہ ہو کہ تمہارے وہ بابا جان پھر میرے کندھوں پہ سوار ہو رہے ہوں؟“ انہوں نے ناگواری سے ذکر کیا تھا، عارفین کوئی بھی نوٹس لئے بغیر چپ چاپ بیٹھا رہا تھا، تھوڑی دیر بعد زونکہ چلی آئی، وہ بھی رابعہ شیرازی جیسی ہی پوچھ گچھ شروع کر چکی تھی اور مجبوراً عارفین وہاں سے اٹھ گیا تھا۔



یسری کی شادی کافی دھوم دھام سے ہوئی تھی، امی اور بہروز بھائی سب کچھ اچھے طریقے سے منپٹ جانے پہ بہت خوش تھے اور زیادہ خوشی اس بات کی تھی کہ اللہ نے انہیں ایک بیٹی کے فرض سے سبکدوش تو کر ہی دیا ہے، اب دو بیٹیوں کا فرض باقی تھا اور انہیں یقین تھا کہ وہ باقی دونوں بیٹیوں کے فرض سے بھی جلد اور احسن طریقے سے فارغ ہوں گے، مگر قسمت کے دھارے کب کس رخ پہ بہہ نکلیں گے یہ آج تک کوئی نہیں جان پایا تھا، وہ لوگ ان دنوں بہت خوش تھے اور انہیں خوشی راس نہیں آئی تھی۔ وہ دن ان کے لئے قیامت کا دن تھا جب بہروز بھائی کے آفس سے فون کال آئی تھی۔

”آپ بہروز صاحب کے گھر سے بول رہی ہیں۔“

”جی میں بہروز بھائی کی بہن بات کر رہی ہوں۔“ ارونی یونیورسٹی سے ڈیڑا جلدی گئی تھی جیسے ہی فون کی بیل ہوئی، اس نے ہی کال ریسیو کی تھی۔



”میں ان کے آفس سے ان کا کوئی بات کر رہا ہوں۔ بہروز صاحب کی طبیعت خراب ہے، انہیں ہسپتال لے گئے ہیں۔ اگر آپ لوگ جانا چاہتے ہیں تو ہسپتال کا پتہ لکھ لیں۔“

”کک..... کیا کہہ رہے ہیں.....؟ کیا ہوا ہے بھائی کو.....؟“ اروٹی کی آواز لڑکھرائی تھی اور کچن میں اروٹی کے لئے کھانا نکالتی امی کے ہاتھ کپکپا گئے تھے، ان کا دل کسی انہونی کے خیال سے بری طرح لرز اٹھا۔

”یا اللہ خیر.....“ انہوں نے بے ساختہ اللہ کو یاد کیا تھا۔ ثمنینہ بھابی بھی اپنے کمرے سے باہر آ گئی تھیں۔

”دل کا دورہ.....؟“ اروٹی کے منہ سے ٹوٹے پھوٹے لفظ نکلے تھے اور وہ زمین پر بیٹھتی چلی گئی تھی۔ ثمنینہ بھابی اپنا سینہ پیٹنے لگی تھیں اور امی کے جسم سے تو جیسے کسی نے روح کھینچ لی تھی۔ پورے گھر میں عجیب سی وحشت چھائی تھی، وہ تینوں بمشکل روتے پیٹتے ہوئے ہسپتال پہنچی تھیں، جہاں بہروز کو اس کے کولینگز اپنی نگرانی میں سنبھالے ہوئے تھے، ان کے ٹیٹ کے جا رہے تھے اور نارمل ٹریٹ منٹ بھی ہو رہی تھی۔ ابھی مزید تفصیلی رپورٹ کا انتظار تھا کہ آخر انہیں ہوا کیا ہے؟ پانچ گھنٹوں کے انتظار کے بعد انہیں رپورٹ ملی تھی جس کے مطابق بہروز حیات کے دل کی شریانوں کا خون منجمد ہو چکا تھا جس کی وجہ سے خون کی گردش میں رکاوٹ پیش آرہی تھی اور رگیں پھٹنے کے قریب ہو رہی تھیں اور شریانوں کی اسی پر اہل کم کی وجہ سے بہروز حیات کے سینے میں درد کی لہریں بڑھتی جا رہی تھیں۔

”ڈاکٹر صاحب اس بیماری کا کوئی حل بھی تو ہوگا؟“ امی روتے ہوئے ڈاکٹر کے سامنے آئی تھیں۔

”اس کا فی الحال ایک ہی حل ہے اور وہ ہے آپریشن..... تاکہ آپریشن کے ذریعے ان کی شریانوں کی بندش دور کی جاسکے۔“ ڈاکٹر صاحب بہت نارمل سے انداز میں تفصیل بتا رہے تھے جبکہ امی آپریشن کا سن کر چپ سی ہو گئیں۔

”آپریشن کب ہوگا ڈاکٹر صاحب اور اس کے لئے ہمیں کیا کرنا ہوگا؟“ اروٹی نے امی کو خاموش ہوتے دیکھ کر مزید پوچھا تھا۔

”آپریشن کل تک ہو جانا چاہیے اور اس کے لئے دو لاکھ روپے کا خرچہ آپ لوگوں کو انورڈ کرنا ہوگا۔ آپ اگر دیر کریں گے تو مریض کی جان کو خطرہ ہوگا۔“ ڈاکٹر کے منہ سے نکلا ایک لفظ اروٹی کے جسم کے رونگھٹے کھڑے کر گیا تھا اروٹی کے کانوں میں سائیں سائیں آواز گونجنے لگی تھی۔

”دولاکھ..... کک..... کہاں سے آئیں گے دولاکھ روپے؟“ وہ دونوں اپنی اپنی جگہ پر ساکت بے جان سی بیٹھی تھیں، ان دونوں کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھانے لگا تھا۔

”کیا ہوا آئی! کیا کہتے ہیں ڈاکٹر صاحب؟“ جرار بہنوئی کی بیماری کا سن کر ابھی ابھی ہاسپٹل آیا تھا، اس کی ہمدردی آواز سن کر امی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھیں۔

”امی پلیز حوصلہ کریں ہمیں کچھ کرنا ہوگا، ہمارے پاس نامم بہت کم ہے۔“ اروٹی نے ماں کے کندھے پر دباؤ ڈالتے ہوئے انہیں رونے سے روکا تھا۔

”بیٹا..... دولاکھ روپے کہاں سے آئیں گے، کیسے جمع ہوگا؟“

”انشاء اللہ ضرور ہوگا۔ آپ بہت کریں۔ آپ کے پاس شاید زیور ہیں؟“ ارونی کو پتہ تھا کہ امی نے وہ زیور سارہ کے اور اس کے لئے بچا کر رکھے ہیں اور مشکل وقت میں اب وہی کام آسکتے ہیں۔

”وہ..... وہ زیور تو.....؟“

”امی! آپ بھائی کی زندگی کے لئے دعا کریں۔ وہ زیور زیادہ ضروری یا اہم نہیں ہیں۔“

”لیکن بیٹا..... دودو چوڑیاں اور ایک ایک لاکٹ سیٹ ہی تو ہے، ان سے دولاکھ پورا تو نہیں ہوگا؟“

”کچھ تو ہوگا نا، آپ گھر چلیں میرے ساتھ، ہم ابھی وہ زیور بیچ دیتے ہیں۔ بھائی! آپ بھائی کے پاس رکھیں، ہم کچھ دیر بعد پھر آجائیں گے۔“ ارونی نے شمینہ بھائی کو تسلی دی۔

”آئیے میں آپ لوگوں کو ڈراپ کر دیتا ہوں۔“ جرار کے پاس گاڑی تھی، اس لئے بڑھ چڑھ کر آفر دے رہا تھا ورنہ مصیبت یا مشکل کے وقت کام آنا اس نے سیکھا ہی نہیں تھا۔

دولاکٹ سیٹ اور چار چوڑیاں بیچ کر انہیں ایک لاکھ روپے کی رقم تو حاصل ہوئی گئی تھی، اب مسئلہ مزید ایک لاکھ روپیہ جمع کرنے کا تھا اور بہت زیادہ سوچ بچار کرنے کے بعد امی نے بہروز بھائی کی بانیگ بیچنے کا فیصلہ کیا تھا۔ بہروز بھائی کی بانیگ کا سن کر ارونی کے دل پہ ہاتھ پڑا تھا، اس کا جی چاہا وہ امی کو منع کر دے مگر اس کے بغیر چارہ بھی تو نہیں تھا۔ چالیس ہزار کی بانیگ بیچنے کے بعد بھی انہیں ساٹھ ہزار کی ضرورت تھی۔

”بھائی! آپ کے پاس بھی تو کچھ زیور تھا..... آپ وہ زیور بیچ دیں، بھائی ٹھیک ہو جائیں تو آپ کو دوبارہ بنوادیں گے۔“ ایک بہن اپنے بھائی کے لئے بھائی کی بیوی کے سامنے ہاتھ پھیلا رہی تھی حالانکہ ایسے وقت میں بیوی کو خود اپنے شوہر کی موت و زندگی کا احساس ہونا چاہیے تھا جس کے لئے بناؤ سنگھار کرنا تھا جس کے لئے زیور پہننا تھا، وہی نہ رہتا تو زیور کس کام کے؟

”میرے زیور تو بک گئے۔“ شمینہ بھائی نے ناگواری سے کہا۔

”کیا مطلب.....؟“

”آپ لوگوں کو پتہ ہوگا مہینہ بھر پہلے میری امی بہت بیمار ہو گئی تھیں اور جرار کے پاس کوئی جاب نہیں تھی، اس لئے امی کے علاج کے لئے میں نے زیور بیچ دیے تھے۔“ شمینہ بھائی کے سفید جھوٹ پر ارونی ہکا بکار ہو گئی تھی، صرف یہ دیکھ کر کہ کیا کوئی بیوی اتنی بے رحم اتنی سنگدل بھی ہو سکتی ہے؟ اس کے بچوں کا باپ، اس کا سرتاج موت کے منہ میں جا رہا تھا اور وہ خود غرضی اور طوطا چٹشی سے کام لے رہی تھی اور ارونی دوسری کوئی بھی بات کیے بغیر واپس پلٹ گئی تھی۔

”آپ نے جھوٹ کیوں بولا باجی؟“ جرار نے حیرت سے بہن کو دیکھا تھا، وہ کمینہ تھا لیکن بہن اس سے بڑھ کر ثابت ہو رہی تھی۔

”چپ رہو تم..... آج اگر میں زیور بیچ دیتی ہوں اور بہروز کو کچھ ہو جاتا ہے تو پھر میرا کیا بنے گا، میرے پاس کیا بچے گا؟ یہ عورتیں مجھے بھلا کیا دیں گی؟ اپنے پاس کچھ جمع پونجی بھی ضرور رکھنی چاہیے، کسی کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا۔“ شمینہ بھائی نے بھائی کی زبان بند کر دی تھی۔



امی نے محلے کی ایک خاتون کے سامنے جھولی پھیلائی تھی اور انہوں نے بیس ہزار روپیہ قرض دیا تھا۔ آٹھ دس ہزار میں انہوں نے گھر کا فرنیچر بیچ دیا تھا۔ دس ہزار سیرمی کے پاس تھے، وہ بھی چپکے سے ماں کے ہاتھ پر رکھ گئی تھی۔ ایک ایک روپیہ جمع کرنے کے بعد بھی بیس ہزار کی ضرورت تھی، ایک لاکھ اسی ہزار جمع ہو چکا تھا۔ اروولی نے بہروز بھائی کے آفس ان کے پاس سے بھی رابطہ کیا تھا لیکن انہوں نے صاف انکار کر دیا تھا کیونکہ بہروز پہلے ہی ان سے سیرمی کی شادی کے لئے کچھ رقم ایڈوانس لے چکا تھا۔

”دیکھئے حامد صاحب! جب تک بھائی ٹھیک نہیں ہو جاتے، ان کی جگہ میں آپ کے آفس میں کام کروں گی۔ پلیز آپ ہماری کچھ ہیلپ کریں، ہمیں بیس ہزار روپے کی ضرورت ہے، کل ان کا آپریشن ہونا بہت ضروری ہے۔“

”ایم سوری میڈم! ہم مزید اپنی رقم ڈبوںے کا رسک نہیں لے سکتے اور پلیز آپ رات کے اس پہر بار بار فون کر کے تنگ مت کریں۔“

حامد صاحب نے انتہائی ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے کھٹاک سے فون بند کر دیا تھا اور اروولی آج کی رات ختم ہونے کا سوچ کر ہی وحشت زدہ ہو گئی تھی۔ ناٹم بارہ سے اوپر کا مورہا تھا، گویا دوسرا دن لگ چکا تھا۔



اگلی صبح امی نے اپنی سلائی مشین اور واشنگ مشین بیچنے کے لئے رکھ دیں مگر دو گھنٹے خوار ہونے کے بعد بھی کسی نے اچھے داموں خریدنے کی زحمت نہیں کی تھی۔

”یہ مشین کتنے کی بک رہی ہے امی؟“ اروولی نے سلائی مشین کو بے زاری سے دیکھا۔

”بیٹا! یہ لوگ تو اسے پرانے لوہے کے بھاؤ خرید رہے ہیں، چار پانچ سو سے زیادہ کوئی نہیں دے رہا۔“ امی کے حلق میں آنسوؤں کا گولا سا نکلنے لگا تھا اور اروولی کی نظر مشین کے رخنے سے جھانکتے سفید کارڈ پر جم گئی تھی، اس نے ایک سیکنڈ میں وہ کارڈ جھپٹا لیا۔

”مسٹر عارفین شیرازی۔“ اس کی نظروں میں عارفین شیرازی کا چہرہ گھوم گیا تھا اور ذہن میں اپنی موجودہ ضرورت چکرانے لگی تھی۔

”اس وقت اگر ہماری کوئی مدد کر سکتا ہے تو وہ عارفین شیرازی ہے۔ مجھے..... مجھے اس سے رابطہ کرنا چاہیے۔“ وہ لپک کر فون کے قریب آئی تھی اور اس کا نمبر ڈائل کیا تھا لیکن اس کے موبائل کا نیٹ ورک نہیں مل رہا تھا۔ اس نے دس منٹ کے اندر اندر تقریباً چالیس پچاس مرتبہ ٹرائی کر لیا تھا مگر دوسری طرف سے جواب ہی موصول نہیں ہو رہا تھا۔ مجبوراً اسے عارفین شیرازی کے آفس جانے کا فیصلہ کرنا پڑا تھا۔

”کہاں جاری ہو اروولی؟“ امی اسے دوپٹہ اور اسکارف لیتے دیکھ کر فوراً بولی تھیں،

”امی! میں اس آدمی کے پاس جاری ہوں جو مجھے یقین ہے کہ ہماری مدد ضرور کرے گا اور آپ بھی اسے جانتی ہیں۔“

”کون ہے بیٹا..... کس کی بات کر رہی ہو؟“ انہوں نے ذرا الجھ کر پوچھا تھا۔

”عارفین شیرازی۔“ اس نے امی کے سامنے کارڈ لہرایا تھا اور امی کی آنکھوں میں مدھم سی روشنی جگمگائی تھی۔

”لیکن بیٹا..... ناٹم بہت کم ہے۔“

”امی! آپ فکر نہ کریں، آپ یہ رقم لے کر ہاسٹل جائیں، تب تک میں بھی آ جاؤں گی۔ بس دعا کریں کہ اس سے ملاقات ہو جائے۔“

اروئی ماں کو تسلی دے کر گھر سے نکل آئی تھی، اس نے روڈ پہ آتے ہی رکشہ والے کو روکا اور کارڈ پہ لکھا ایڈریس سمجھایا تھا۔

آدھن گھنٹے کے بعد وہ عارفین شیرازی کے عالی شان آفس میں موجود تھی۔ یہاں آنے سے پہلے وہ بہت پر یقین تھی، اسے پورا بھروسہ تھا کہ عارفین شیرازی اس کی پرابلم سن کر ضرور ہیلپ کرے گا لیکن یہاں آ کر اس کا سارا یقین سارا بھروسہ بکھر سا گیا تھا۔ اتنا امیر کبیر انسان، اتنا بڑا بزنس مین..... اتنی معروف شخصیت کو بھلا کیا پتہ کہ وہ کون ہے اور اس سے ملاقات کہاں ہوئی ہے؟ اگر اس نے پہچاننے سے ہی انکار کر دیا تو..... تو کیا کرے گی وہ؟ کہاں جائے گی؟ کس سے بھیک مانگے گی؟ کس سے کہے گی کہ اس کے بھائی کی زندگی کا سوال ہے؟“ عارفین شیرازی کے مکمل روئے کا سوچ کر ہی اس کے ماتھے پہ پسینہ آ گیا تھا۔ اس کا دل گھبرانے لگا تھا۔

”ایک گلاس پانی مل سکتا ہے پلیز.....“ اس نے پاس سے گزرتے بیون کو مخاطب کیا تھا۔

”میس میم.....“ وہ فوراً پانی لے آیا تھا اور اس کی حالت کے پیش نظر وزیٹنگ روم کے اے سی کی کولنگ اسپید بڑھا دی تھی۔

عارفین منیجر صاحب سے کوئی بات ڈسکس کرتے ہوئے اپنے روم سے باہر نکلا تھا، جب اس کی نظر نڈھال سی اس لڑکی پہ پڑی جو آج بھی اس کے حافظے میں محفوظ تھی۔

”اروئی.....“ بے ساختہ ہی اس کا نام بھی ذہن سے زبان تک پہنچ گیا تھا اور عارفین کے لئے یہ مزید حیرت کی بات تھی کہ وہ اس لڑکی کو نام سمیت یاد رکھے ہوئے تھا۔

”میم..... آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“ آفس کی ایک لیڈی ورکر نے اٹھ کر اس کا حال پوچھا تھا۔

”جج..... جی..... میں ٹھیک ہوں.....“ اروئی واپسی کے لئے کھڑی ہو گئی تھی۔

”میم..... آپ تو سر سے ملنے کے لئے آئی تھیں۔“

”نن..... نہیں..... مم..... میں پھر کبھی آ جاؤں گی.....“ اروئی کو ناکامی کا سوچ کر چکر آنے لگے تھے کہ اب بہ روز بھائی کا کیا ہوگا؟

”رکیے مس اروئی.....“ عارفین کی بھاری اور بلند آواز نے جہاں اروئی کے قدم روک دیے تھے، وہیں آفس کے پورے شاف کوٹھکا دیا تھا کیونکہ اس کے لہجے اور انداز میں بے ساختگی کے ساتھ ساتھ بے چینی بھی تھی۔ اروئی نے حیرت سے پیچھے مڑ کر دیکھا تھا۔ اسے یقین نہیں آیا تھا کہ عارفین شیرازی نے اسے اس کے نام سے پکارا ہے؟ گویا وہ اس کو بھی پہچانتا تھا اور اس کا نام بھی جانتا تھا۔

”آئیے، آپ واپس کیوں جا رہی ہیں؟“ اس نے آگے بڑھ کر اسے اپنے آفس روم میں آنے کی پیشکش کی تھی اور اروئی کو لگا، اللہ نے کوئی دعا سن لی ہے۔ وہ اس کے ساتھ اس کے سپر لگژری روم میں داخل ہوئی تھی۔ سکون اور ٹھنڈک کا احساس پورے کمرے میں بکھرا تھا۔ یہاں آ کے احساس ہوا کہ زندگی کے لئے کچھ بل سکون کے بھی بے حد ضروری ہیں۔

”بیٹھے.....“ اس نے کرسی کی سمت اشارہ کیا تھا اور خود دوسری چیئر گھسیٹ کر اس کے مقابل ہی بیٹھ گیا تھا۔



”ماں جی کیسی ہیں؟“ اس نے چھوٹے ہی حال احوال پوچھا تھا۔  
”جی ٹھیک ہیں۔“ وہ آہستگی سے بولی تھی۔

”اور آپ.....؟“ عارفین کو وہ پہلے روز جیسی فریش نہیں لگی تھی، اسی لئے گہری نظروں سے جانچتے ہوئے اس کا حال بھی پوچھ لیا تھا۔  
”میں بھی ٹھیک ہوں لیکن.....“ وہ اپنا مدعا بیان کرتے کرتے رک گئی تھی، نہ جانے کیوں دل نہیں مان رہا تھا کہ وہ اس اجنبی آشنا سے کچھ مانگے۔  
”لیکن کیا مس اردوئی..... آپ پلیز کھل کر بات کریں، میں جانتا ہوں آپ اس وقت یقیناً کسی مصیبت میں ہیں۔ پلیز بتائیے گھر میں سب ٹھیک ہیں نا؟ آپ کے بہن بھائی سب کیسے ہیں؟“ امی اس روز باتوں باتوں میں اپنی ساری فیملی کے متعلق بتا گئی تھیں، تب ہی وہ اتنی بے تکلفی سے پوچھ رہا تھا۔

”بہروز بھائی کو کل آفس میں کام کے دوران دل کا دورہ پڑا ہے، وہ اس وقت ہسپتال میں ہیں، ڈاکٹر زان کے لئے آپریشن تیار ہے ہیں۔ آج شام پانچ بجے کا ٹائم دیا ہے آپریشن کے لئے مگر.....“ بات کرتے کرتے وہ ٹھہر سی گئی تھی اپنے جیسے اپنے برابر کے انسان کے سامنے اپنا حال، اپنا سوال رکھتے ہوئے انسان کو اتنی جھجک اتنی عار نہیں آتی جتنی اس انسان سے آتی ہے جو حالات اور مقام میں ان سے بہتر اور ان سے اوپر ہو۔ یہی حال اردوئی کا تھا۔

”مگر.....“ عارفین نے اس کی بات سننے کے لئے اسے لفظ کا ایک سرائیمیا تھا۔  
”مگر ہمیں دو لاکھ روپے کی ضرورت تھی جو ہم نے جیسے تیسے جمع کر لیا ہے مگر بیس ہزار ابھی بھی کم ہیں اور ہمارا اس شہر میں کوئی بھی جاننے والا نہیں ہے۔“ اردوئی کا چہرہ جھکا ہوا تھا اور حلق میں بے بس آنسو اٹک رہے تھے، حالت ایسی تھی جیسے کسی نے بدن سے سارا ہونچوڑ لیا۔  
”کیش کی ضرورت ہے یا چیک کی؟“ عارفین اس لڑکی کی بے بسی کی حد جانتا تھا، وہ اپنی خودی کو مار کے یہاں تک آئی تھی اور یہاں لانے والا اور کوئی نہیں تھا، صرف بہن اور بھائی کا رشتہ تھا، ایک بہن ایسی مجبور، ایسی بے بس ہوئی تھی کہ بھائی کے لئے کسی اجنبی در پہ سوالی بننے سے بھی نہیں کتراتی تھی، حالانکہ جو کچھ اس کا حال ہو رہا تھا یا تو وہ خود جانتی تھی یا پھر اس کے سامنے بیٹھا عارفین شیرازی۔  
”کیش.....“ اردوئی کی زبان بولتے ہوئے لڑکھڑا گئی تھی۔ عارفین نے کال کر کے منیجر صاحب سے کیش منگوا لیا تھا اور رقم اردوئی کے حوالے کی تھی۔

”لیکن سرائیہ تو بہت زیادہ ہے، ہمیں تو صرف بیس ہزار روپے کی ضرورت ہے۔“ اردوئی نے چالیس نوٹ دیکھ کر جلدی سے کہا تھا۔  
”یہ بات آپ کو آپریشن کے بعد پتہ چلے گی کہ آپ کو صرف بیس ہزار کی ضرورت ہے یا اور بھی رقم چاہیے؟“ عارفین دوران مدیشی سے کام لے رہا تھا۔

”کیا مطلب سر.....؟“  
”آپ مطلب کے چکر میں نہ پڑیں اور پانی پیئیں۔“ اس نے پیون کے لائے ہوئے لوازمات کی طرف اشارہ کیا تھا۔

”تھینک یوسر! میں پانی لے چکی ہوں، مجھے اس وقت ہاسپٹل جانا ہے، امی میرا انتظار کر رہی ہوں گی۔“ ارونی اٹھنے کے لئے پرتو لگتی تھی۔  
 ”اوکے، آپ جاسکتی ہیں۔“ عارفین اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا تھا۔

”سر! میں آپ کی یہ رقم ادھار لے کر جا رہی ہوں، جیسے ہی بھائی ٹھیک ہوں گے، میں آپ کو واپس دے جاؤں گی لیکن مجھے اس وقت سمجھ نہیں آ رہا کہ میں آپ کا شکریہ کن لفظوں میں ادا کروں؟ مجھے امید نہیں تھی کہ آپ اس طرح ہماری ہیلپ کریں گے۔“  
 ارونی سچ مچ اس کے احسان پہ تذبذب کا شکار ہو رہی تھی۔

”جب آپ یہ ادھار واپس کرنے آئیں گی، تب شکریہ کے لئے لفظ بھی ڈھونڈ لائیے گا، اس وقت آپ کو دیر ہو رہی ہے۔“ وہ انتہائی دلکش سے انداز میں مسکراتے ہوئے اسے جانے کا سگنل دے رہا تھا اور ارونی، عارفین شیرازی کی اچھائی کی چھاپ دل پہ لئے وہاں سے نکل آئی تھی، اسے آج یقین ہو گیا تھا کہ دنیا میں ابھی بھی عارفین شیرازی جیسے اچھے لوگ موجود ہیں اور دنیا شاید انہی کی اچھائی کے سہارے قائم تھی ورنہ تو بہت کچھ ایسا بھی تھا جو کائنات کو تباہ و برباد کرنے کے لئے کافی تھا۔



پاک، سوسائٹی ڈاٹ کام آپکو تمام ڈائجسٹ  
 ناولز اور عمران سیریز بالکل مفت پڑھنے کے ساتھ  
 ڈائریکٹ ڈاؤنلوڈ لنک کے ساتھ  
 ڈاؤنلوڈ کرنے کی سہولت دیتا ہے۔  
 اب آپ کسی بھی ناول پر بٹن والا ڈرامہ  
 آن لائن دیکھنے کے ساتھ ڈائریکٹ ڈاؤنلوڈ  
 لنک سے ڈاؤنلوڈ بھی کر سکتے ہیں۔

For more details kindly visit  
<http://www.paksociety.com>



رابعہ شیرازی کی آنکھیں زونلہ کی رپورٹ دیکھ کر پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔

”آریو آل رائٹ مام؟“ عارفین نے تیزی سے اٹھ کر ان کے ہاتھ سے زونلہ کے میڈیکل ٹیسٹ کی رپورٹ تھامی تھی اور نیکیو رزلٹ دیکھ کر اس کی حالت بھی رابعہ شیرازی سے کم نہیں ہوئی تھی۔

”زونلہ بانجھ ہے.....؟ وہ..... وہ کبھی ماں نہیں بن سکتی؟“ رابعہ شیرازی زیر لب بڑبڑاتی تھیں اور عارفین اپنے ماؤف ہوتے ذہن کو یکجا کرنے میں لگا ہوا تھا۔ تین روز پہلے ہی ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق زونلہ چند ٹیسٹ کروا کے گئی تھی لیکن ان کی رپورٹ تین روز بعد ملنی تھی لیکن آج زونلہ کو بہت تیز بخار تھا، اس لئے اس کی رپورٹ لینے کے لئے رابعہ شیرازی خود اس کے ساتھ آئی تھیں۔

”کیا زونلہ کا علاج نہیں ہو سکتا ڈاکٹر؟“ رابعہ شیرازی نے ڈاکٹر فائزہ کو امید بھری نظروں سے دیکھا تھا۔

”مسز رابعہ شیرازی! آپ تو جانتی ہیں اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کے لئے شفا رکھی ہے، ہر چیز کے لئے علاج بنایا ہے۔ سب کچھ ہو سکتا ہے لیکن بانجھ پن ایک ایسا مرض ہے جس کو کوئی دوا اور نہیں کر سکتی۔ ہاں اللہ چاہے تو کچھ بھی ہو سکتا ہے، وہ سوکھے درخت ہرے بھرے کر دیتا ہے، بخر عورت کو آباد کرنا اس کے لئے مشکل تو نہیں ہے۔“ ڈاکٹر فائزہ دل کی گہرائی سے کہہ رہی تھیں اور رابعہ شیرازی چپ ہو کے رہ گئیں۔ ہاسپٹل سے واپسی کے دوران بھی وہ دونوں ماں بیٹا اپنی اپنی سوچوں میں گم رہے تھے جیسے ہی گاڑی گھر کے اندر داخل ہوئی تھی، رابعہ شیرازی اپنے تمام خیالوں سے چونک کر پورے حواسوں میں لوٹ آئی تھیں کیونکہ سامنے روش پہ بابا جان کی گاڑی کھڑی تھی، وہ ابھی ابھی آئے تھے شاید۔

”عارفین! زونلہ کی رپورٹ کے بارے میں بابا جان کو کچھ مت بتانا۔“ انہوں نے بیٹھے بیٹھے کچھ سوچا اور عارفین کو منع کیا تھا۔

”لیکن مام! یہ بات چھپنے والی تو نہیں ہے۔“ عارفین کو پردہ ڈالنے پر اعتراض ہوا تھا۔

”لوگ یہاں قتل کر کے چھپا لیتے ہیں، تم بات چھپانے کا کہہ رہے ہو۔“ رابعہ شیرازی تیز لہجے میں بولی تھیں اور گاڑی کا دروازہ کھول کے نیچے اتر گئی تھیں۔ عارفین الجھتا ہوا کتنی ہی دیر یونہی بیٹھا رہا تھا، اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ بابا جان کیا کریں گے اور رابعہ شیرازی کیا کریں گی؟ دونوں طرف دشمن اپنے اپنے محاذ پہ ڈٹے ہوئے تھے۔ کوئی بھی ایک دوسرے سے مات کھانے پہ تیار ہی نہیں ہوتا تھا اور ان کی دشمنی میں عارفین خواستہ سید و ج بنا ہوا تھا۔ وہ اب رابعہ شیرازی کے کسی نئے پلان کے متعلق سوچ کر جھنجھلاتا ہوا گاڑی سے اتر آیا تھا۔

”کیا بات ہے، کہاں گئے تھے دونوں ماں بیٹا؟“ بابا جان نے چھوٹے ہی استفسار کیا تھا۔

”زونلہ کی میڈیکل رپورٹ آنا تھی، آج وہی لینے گئے تھے لیکن آج ڈاکٹر چھٹی پہ چلی گئی، اسی لئے رپورٹ نہیں مل سکی۔“ عارفین کی بجائے رابعہ شیرازی نے جواب سے نوازا تھا کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ بابا جان کو بھی آج زونلہ کی میڈیکل رپورٹ کا ہی انتظار ہوگا، اسی لئے وہ گاؤں سے شہر آئے تھے اور اس سے پہلے کہ وہ پوچھتے رابعہ شیرازی نے خود ہی بتا دیا تھا تا کہ عارفین کو کچھ بولنے کا موقع نہ ملے اور حقیقتاً عارفین نے ماں کے سفید جھوٹ پہ انہیں ذرا الجھ کر دیکھا تھا کہ آخر یہ بات چھپانے کے پیچھے ان کا مقصد کیا ہے؟

”ڈاکٹر کب آئے گی؟“ بابا جان آئندہ کا پوچھ رہے تھے۔

”جب آئے گی وہ لوگ فون پہ انعام کر دیں گے، شاید شہر سے باہر گئی ہے۔“ رابعہ شیرازی ساڑھی کا پلو لا پروائی سے جھاڑتے ہوئے اپنے بیڈروم میں جانے کے لئے پلٹی تھیں۔

”اپنی ڈاکٹر صاحبہ سے کہنا، ذرا جلدی آجائیں ورنہ کہیں دیر نہ ہو جائیں۔“ باباجان نے لقمہ دیا تھا اور رابعہ شیرازی نے پلٹ کر باباجان کر دیکھا۔

”میں اپنی بھانجی کا اگر علاج کروانا ہو تو انگلینڈ یا امریکہ سے بھی کروا سکتی ہوں۔ پاکستان کے ڈاکٹر ز میرے لئے کوئی معنی نہیں رکھتے لیکن میرا پورا یقین ہے کہ وہ انشاء اللہ جلد ہی ماں بھی بنے گی اور آپ کی قسم بھی ٹوٹے گی۔“ وہ نخوت سے بولیں۔

”میں تو چاہتا ہی یہی ہوں، بہو صاحبہ کہ میری قسم ٹوٹے اور زونکہ جلد از جلد مجھے پر دادا کے عہدے پر فائزہ کر دے۔“ باباجان رابعہ شیرازی کی بات سے لطف اندوز ہوئے تھے۔

اتنے میں باباجان کا موبائل فون بج اٹھا تھا جو اس وقت ٹیبل پہ رکھا تھا۔

”دیکھو بیٹا کس کا فون ہے۔“ انہوں نے عارفین کو اشارہ کیا کیونکہ وہی قریب بیٹھا ہوا تھا۔

”مہر النساء آئی کا فون ہے۔“ رابعہ شیرازی نے ٹھٹک کر دیکھا۔ باباجان نے اسے کال ریسیو کرنے کا کہا اور پھر عارفین مہر النساء سے باتیں کرنے لگا، اس کے بعد فون باباجان نے لے لیا لیکن رابعہ شیرازی تملاتی ہوئی وہاں سے نکل گئی تھیں۔

”ہونہ..... مہر النساء آئی..... جاو گرنی..... چال باز عورت..... اداؤں کے تیر چلانے والی..... زندگی بھر چچھانہیں چھوڑے گی میرا۔“ وہ بڑبڑاتی ہوئی میز ہیاں چڑھ کر زونکہ کے پاس آئی تھیں کیونکہ بانجھ پن جیسی ہولناک خبر اسے بھی تو سنانی تھی۔ زونکہ کا بخار پہلے سے قدرے کم تھا، تب ہی وہ اٹھ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ رابعہ شیرازی نے آتے ہی اسے گلے لگا کر پیار کیا تھا اور اپنے آپ کو وہ خبر سنانے کے لئے تیار کرنے لگی تھیں۔



آپریشن کے دوسرے روز جب بہروز بھائی کے لئے نئی دوائیاں لانے کی ضرورت پڑی تو ارونی کو خود بخود عارفین شیرازی کی بات یاد آگئی۔

”یہ بات آپ کو آپریشن کے بعد پتہ چلے گی کہ آپ کو صرف بیس ہزار کی ضرورت ہے یا اور بھی رقم چاہیے؟“ وہ اس کی بات اور دورانہدیشی کی قائل ہو گئی تھی۔ باقی بچنے والے بیس ہزار میں سے دس ہزار تو دوسرے روز فوراً ہی دوائیوں پہ خرچ ہو گئے تھے اور اب مزید گزرا دس ہزار میں ہی کرنا تھا۔ حالانکہ ڈاکٹر بتا رہے تھے کہ بہروز بھائی کا علاج بہت مہنگا پڑے گا ان لوگوں کو لیکن ان کی کنڈیشن ایسی تھی کہ وہ علاج چھوڑ بھی نہیں سکتے تھے اور علاج کروانا بھی بس سے باہر ہو رہا تھا۔

دو تین روز میں ہی ان کی ہمت جواب دے گئی تھی گو کہ بہروز بھائی اس وقت ہوش میں آچکے تھے اور ان لوگوں سے بات چیت بھی کر رہے تھے لیکن پھر بھی ان لوگوں کی پریشانی کم نہیں ہو رہی تھی کیونکہ ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق ان کا علاج مزید چھ ماہ تک لگاتار جاری رہنا بے حد ضروری تھا اور ساتھ ہی بیڈریسٹ کی بھی اشد ضرورت تھی۔ اگر ان چھ ماہ میں وہ لوگ کوئی بے احتیاطی یا کوئی کوتاہی کرتے تو انہیں مزید کسی ایک کا خدشہ ہو سکتا تھا اور ڈاکٹر کی انہی ہدایات کو لے کر امی اور ارونی بے حد پریشان تھیں۔ پریشانی تو یسری، سارہ اور شمینہ بھابی کو بھی تھی لیکن ان کی پریشانی اس لیول تک نہیں تھی جہاں تک



اروئی اور امی کو ہوری تھی کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ اب جمع پونجی کے نام پہ ان کے پاس ایک روپیہ یا ایک چھلانگ نہیں ہے۔ وہ لوگ پہلے جھکے میں ہی کنگال ہو چکے ہیں تو آئندہ کیا ہوگا اور اس ”آئندہ“ نے اروئی کو بڑی گہری سوچوں کی تحویل میں دے دیا تھا۔

وہ پورا دن اور پوری رات ”آئندہ“ کے فکرنے میں جکڑی رہی تھی اور پھر فجر کے وقت نماز پڑھنے کے بعد اس نے دعا مانگی اور ساتھ ہی ایک فیصلہ کیا تھا اور اس فیصلے میں رب کی رضا چاہی تھی۔ اگر اس کا رب اس کا ساتھ دیتا تو وہ کچھ بھی کر سکتی تھی اور اسے یقین تھا کہ اس وقت اس کا رب اس کی دعا قریب سے سن رہا ہے اور سننے کے بعد پوری بھی کرے گا۔ وہ نماز اور دعا سے فارغ ہو کر امی کے پاس آگئی تھی، رب کی رضا کے بعد ماں کی رضائیں بہت ضروری تھا اور ماں کو اپنی عزت و آبرو، اپنی شرم و حیا، اپنی انا اور آن کا پورا یقین دے کر وہ گھر سے نکلی تھی۔

اس کی ماں نے اس پہ بھروسہ کیا تھا، اور اجازت دے دی تھی۔ وہ گھر سے نکلی تو اپنی آن بان اس کے ساتھ تھی، اسے اپنوں کے پیار اور حوصلہ افزائی پہ بھی بڑا مان تھا، اب وہ جنگ لڑنے کو تیار تھی۔



سات دن..... یعنی پورا ایک ہفتہ ہو چکا تھا اروئی کو جاب کے لئے جگہ جگہ جوتیاں چٹختے چٹختے لیکن ”نویکنسی“ تو جیسے ہاتھ دھو کے پیچھے پڑ گئی تھی، سات روز میں وہ اتنی ذلیل اور خوار ہو چکی تھی کہ اسے ان تمام مردوں کے حوصلے پہ رشک آنے لگا تھا جو مہینوں اور سالوں نوکریاں ڈھونڈتے تھے لیکن ناکامی کی صورت میں بھی ہمت نہیں ہارتے تھے۔ اروئی چونکہ ہمت ہار چکی تھی لیکن حوصلہ اتنا بلند تھا کہ وہ ہر صبح نئے عزم سے نکل پڑتی تھی۔ آج بھی ایسا ہی ہوا تھا، وہ گھر سے نکلی تو سب سے پہلے اس نے آج کا اخبار خریدنے کا سوچا تھا۔ تھوڑی دور پیدل چل کر آئی تو اسے روڈ پہ اخبار بیچنے والا بھی نظر آ گیا تھا۔ اس نے بارہ روپے میں اخبار خریدا اور پھر ”ضرورت ہے“ کے تمام اشتہار دیکھتی فٹ پاتھ پہ آکھڑی ہوئی تھی۔ کھڑے کھڑے ہی وہ اپنی مطلوبہ نوکری کے لئے نظریں دوڑانے لگی تھی اور پھر ایک جگہ اسے ”پرنس اسٹنٹ“ کی ضرورت ہے، کا اشتہار نظر آیا تھا اور پھر اروئی نے فوراً ہی اخبار پہ درج ذیل بلاک نمبر اور بلڈنگ کا ایڈریس نوٹ کر لیا تھا۔

جلدی اور بے دھیانی میں اسے یہ بھی پتہ نہیں چلا تھا کہ وہ اس ایڈریس پہ پہلے بھی ایک بار جا چکی ہے۔ اس نے کلائی پہ بندھی ریسٹ واپج پہ قائم دیکھتے ہوئے جلدی سے ٹیکسی والے کو روکا تھا اور اپنا مطلوبہ ایڈریس اس کے سامنے رکھا۔ ٹیکسی جس بلڈنگ کے سامنے رکی، وہ یہاں پہلے بھی آچکی تھی، اس نے واپس پلٹنے کا ارادہ کیا تب ہی کچھ سوچ کر اندر داخل ہو گئی۔ اس سے پہلے وہاں سات لڑکیاں موجود تھیں، وہ آٹھویں تھی، وہاں موجود ساتوں نے اس کا تنقیدی جائزہ لیا تھا کیونکہ اس کا حلیہ اس جاب سے قطعی میچ نہیں کر رہا تھا کیونکہ وہاں جتنی بھی موجود تھیں، سب کا فیشن ایک سے بڑھ کر ایک تھا، لباس سے لے کر میک اپ پر انہوں نے پوری پوری توجہ دی تھی۔ حتیٰ کہ ان کے بیگز اور سینڈل بھی میچنگ کے تھے جبکہ اروئی کی ایسی کوئی بھی تیاری نہیں تھی، بس وہ دل میں دعا کرتی ہوئی باقی سب کے ساتھ بیٹھ گئی تھی۔ ساڑھے نو بجے انٹرویو شروع ہوا اور تقریباً ساڑھے گیارہ بجے اروئی کی باری آگئی تھی۔ آج بھی وہ مایوسی اور آس و امید کے درمیان ڈوبتی ہوئی ابھی اور ایم ڈی کے روم کا دروازہ کھول کر اندر گئی تھی، اس امید کے ساتھ کہ اس کا سامنا عارفین سے نہیں ہوگا لیکن اندر آتے ہی اس کے قدم لڑکھڑا گئے تھے۔ اس کے چہرے کی رنگت بدل گئی تھی، وہ تو پہلے ہی اس

شخص کی مقروض تھی، اب پھر اس کے سامنے جاب کے لئے.....

”نہیں نہیں..... میں یہاں جاب نہیں کر سکتی، مجھے واپس چلے جانا چاہیے۔“ وہ اپنے آپ کو واپس پلٹنے پہ آمادہ کر رہی تھی جب عارفین نے دروازے کی سمت دیکھا تھا اور اروی کو اپنی فائل کے ہمراہ تذبذب کا شکار دیکھ کر چونک گیا۔ وہ شاید آج بھی واپس لوٹ جانے کا فیصلہ کر رہی تھی۔

”آئیے بیٹھے۔“ عارفین کی آواز پہ وہ چونک اٹھی اور بمشکل اس کی سمت دیکھ پائی تھی۔

”تشریف رکھئے میم.....“ اب کی بار ایک سائیڈ پہ بیٹھے منیجر صاحب نے کہا تھا اور مجبوراً اروی کو واپسی کا ارادہ ترک کرتے ہوئے آگے بڑھنا پڑا تھا۔

”السلام علیکم!“ اس نے بیٹھتے ہوئے بے حد آہستگی سے کہا۔

”وعلیکم السلام!“ عارفین نے کچھ بھی کہے بغیر اس کی فائل کے لئے ہاتھ بڑھایا تھا اور اس نے ہمت کر کے فائل اس کے سامنے رکھ دی جس میں اروی کا تعلیمی ریکارڈ محفوظ تھا اور عارفین اس کا یہ ریکارڈ دیکھ کر بہت خوش ہوا تھا۔

”آپ جانتی ہیں۔“ آپ اس وقت ایک پی اے کی جاب کے لئے انٹرویو دینے آئی ہیں۔“

”جی سر.....“ ایک پی اے پہ کتنی رسپانس ہوتی ہے، اس کا اندازہ ہے آپ کو؟“

”جی سر اندازہ ہے مجھے۔“

”آپ کے خیال میں آپ یہ جاب کر سکتی ہیں؟“

”سر! جب ایک مجبور ایک غریب اپنے گھر سے ”کچھ کرنے“ کا ارادہ لے کر نکلتا ہے تو وہ اپنے ساتھ ہمت، حوصلہ، صبر اور محنت کا عزم لے کر نکلتا ہے، وہ اپنی دل پاور دیکھ کر قدم بڑھاتا ہے، میں بھی اپنی دل پاور دیکھ کر ہی یہاں تک آئی ہوں۔ ہو سکتا ہے یہ جاب میرے بس سے باہر ہو لیکن اس جاب کو اپنے بس میں کرنا میری مجبوری ہے، اگر نہ کروں تو پھر میں ”بے بس“ رہ جاؤں گی۔“ پہلی بار اس نے اتنی پراعتماد بات کی تھی، عارفین کو اچھا لگا تھا اور منیجر صاحب بھی جان گئے کہ وہ لڑکی ذمہ دار اور محنتی ہے، لہذا منیجر صاحب سے ذرا سے باہمی مشورے کے بعد عارفین نے اسے جاب کے لئے اپائنٹ کر لیا تھا، باقی سب لڑکیاں ناک بھوں چڑھاتے ہوئے وہاں سے رخصت ہوئی تھیں جبکہ اروی باہر بیٹھی عارفین کے بلاوے کی منتظر تھی۔ تھوڑی دیر بعد اسے اندر بلایا گیا تھا۔

”مس اروی حیات! آپ کل صبح نو بجے سے جوائن کر سکتی ہیں، باقی تفصیلات آپ کو منیجر صاحب سمجھا دیں گے، اگر کسی اور گائیڈنس کی ضرورت ہو تو آپ مجھے بتا سکتی ہیں۔“ عارفین بہت نرمی اور تحمل سے سمجھا رہا تھا۔

”سر! کیا میں جان سکتی ہوں کہ یہ جاب مجھے کس چیز کے بل بوتے پر مل رہی ہے؟“ اروی کے ذہن میں پھانس کی طرح ان کا سوال نوک زبان پہ آئی گیا تھا۔ عارفین نے چونک کر اس عجیب سی لڑکی کو دیکھا تو جو کبھی صرف ایک ملاقات کے بل بوتے پہ اپنے پورے یقین کے ہمراہ اس سے کچھ رقم قرض کے طور پر مانگنے آگئی تھی اور کبھی وہ اپنی تمام کوالیفیکیشن کا ریکارڈ اس کے سامنے رکھ کر بھی جاب ملنے پہ مشکوک اور غیر مطمئن نظر آ رہی تھی۔



”آپ کو اپنی ذہانت پہ کوئی شک ہے؟“ عارفین نے اسے بغور دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

”میں اس وجہ سے نہیں پوچھ رہی، مجھے بس آپ کی.....“ اروی جو کہنا چاہتی تھی، وہ کہنا اسے خود ہی مناسب نہیں لگا تھا، تب ہی کچھ کہتے کہتے ہی خاموش ہو گئی تھی۔

”مس اروی حیات! میں اتنا جذباتی انسان نہیں ہوں کہ کسی ہمدردی میں آ کر اپنا اتنا بڑا نقصان کر بیٹھوں، اس جاب کے لئے مجھے آپ میں کچھ مطلوبہ کوالٹیز نظر آئی ہیں تو میں آپ کو اپائنٹ کر رہا ہوں ورنہ میں انکار بھی کر سکتا تھا۔“ اس نے اروی کو بہت واضح الفاظ میں جواب دیا تھا، وہ کچھ ریلیکس ہو گئی تھی لیکن دل کے اندر ابھی بھی ”کچھ“ مطمئن نہیں تھا۔

”او کے سر! میں چلتی ہوں۔“ وہ اجازت لے کر کھڑی ہو گئی تھی اور عارفین سر جھٹک کر اپنے سامنے رکھی فائلز دیکھنے لگا تھا جو اس کی توجہ مانگ رہی تھیں۔



زونکہ اور رابعہ شیرازی کی راتوں کی نیندیں اڑی ہوئی تھیں، وہ زونکہ کے ہانچے پن کو لے کر پریشان تھیں کیونکہ اپنی قسم اپنے عہد اپنے چیلنج کے مطابق اگر بابا جان عارفین کی شادی اپنی پسند سے کر دیتے تو پھر ان کے پاس کچھ نہیں رہ جاتا تھا کیونکہ بابا جان تو شروع سے ہی اپنی بیٹی مہر النساء کے گن گاتے تھے اور اگر عارفین، مہر النساء کی بیٹی سے شادی کر کے مہر النساء کی طرف مائل ہو جاتا، انہی کے گن گاتا اور انہی کی بیٹی کے لطن سے پیدا ہونے والی اولاد کے بل بوتے پہ وہ صاحب اولاد کہلاتا تو یہ رابعہ شیرازی کے لئے مرجانے کا مقام تھا، وہ کبھی مہر النساء سے شکست کھانے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھیں، چاہے اس کے لئے انہیں کسی بھی حد سے گزرنا پڑتا۔ وہ پوری دنیا سے شکست کھا سکتی تھیں لیکن مہر النساء سے نہیں۔

”میں نے ایک فیصلہ کیا ہے عارفین.....“ عارفین دو روز سے گاؤں گیا ہوا تھا، بی بی جان کی طبیعت خراب تھی، اس لئے بابا جان نے اسے خود بلایا تھا اور وہ ابھی واپس آیا تھا کہ رابعہ شیرازی نے بلالیا۔

”کیسا فیصلہ ماں؟“

”تم اور زونکہ ایک بچہ اڈاپٹ کرو گے۔“ انہوں نے بہت ہی سکون سے ہم پھوڑا تھا۔

”واٹ..... یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟“ عارفین اپنی جگہ پہل کے رہ گیا تھا۔

”میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ میں نے زونکہ سے بھی بات کی ہے، وہ کہتی ہے مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ میں کوئی بھی بچہ گود لے سکتی ہوں۔“ وہ اتنی بڑی بات اتنے سکون اور اتنے تحمل سے کر رہی تھیں کہ عارفین حیران رہ گیا تھا۔

”مگر مجھے اعتراض ہے ماں..... میں کسی کا کوئی بھی بچہ اڈاپٹ نہیں کر سکتا، مجھ میں اتنا ظرف نہیں کہ میں ساری زندگی کسی اور کی اولاد کسی اور کا خون سینے سے لگا کے رکھوں اور اس کی کیئر کروں۔ آپ بھول جائیں کہ میں ایسا کوئی قدم اٹھاؤں گا۔“ وہ سختی سے انکار کر کے اوپر جانے کے پلٹ گیا تھا۔

”عارفین..... میری بات سنو.....“ رابعہ شیرازی بلند آواز سے بولی تھیں، اس کے قدم رک گئے تھے۔

”اگر تم لوگ بچہ اڈاپٹ نہیں کرو گے تو زونکہ کا کیا بنے گا؟“ کیا بابا جان کے کہنے پہ دوسری شادی کرنا چاہتے ہو؟“ وہ عارفین کی رائے جاننا چاہتی تھیں۔

”آپ زونکہ سے کہیں کہ وہ اپنا میڈیکل ٹریٹ منٹ کروائے اور رہتی بات دوسری شادی کی تو وہ میں نے ابھی نہیں سوچا۔ اگر بابا جان میری شادی یا میری اولاد سے خوش ہوتے ہیں تو میں یہ بھی کر لوں گا۔“ وہ رابعہ شیرازی کو حیران پریشان چھوڑ کر اوپر چلا گیا تھا۔

”گویا عارفین ابھی سے میرے ہاتھوں سے ٹکنا شروع ہو گیا ہے، وہ ان کے گن گانے لگا ہے۔ تو کیا وہ مہر النساء کی بیٹی کو بیاہ کے لے آئے گا؟ اس مہر النساء کی بیٹی جس کے فراق میں مجھے میرے ہی شوہر نے چھوڑ دیا؟ اس نے اس عورت کے لئے مجھ سے منہ پھیر لیا؟ مجھے نظر انداز کر کے چلا گیا؟ مجھے غیر اہم کر گیا، مجھے دو کوڑی کا کر کے رکھ دیا اس شخص نے؟ صرف..... صرف اس عورت، اس مہر النساء کی خاطر اس کے عشق اور فراق میں ڈوب کر اس نے میری ذات بے وقعت کر ڈالی اور اب۔ اب اس کی بیٹی اس گھر میں آئے گی میرے بیٹے کی دلہن بن کے؟ ہرگز نہیں..... ایسا کبھی نہیں ہوگا..... رابعہ شیرازی مرجائے گی لیکن ایسا نہیں ہونے دے گی، چاہے مجھے خود عارفین کی دوسری شادی کسی اور سے کرنا پڑ جائے لیکن مہر النساء کی بیٹی..... کبھی نہیں۔“ رابعہ شیرازی اپنی سوچوں میں پھنکارتی ہوئیں اٹھ گئی تھیں، ان کا ذہن اب نئے پلان ترتیب دے رہا تھا۔ اب وہ عارفین کی خفیہ شادی کے بارے میں سوچ رہی تھی جس کا بابا جان کو بھی علم نہ ہوتا اور بچہ بھی ہو جاتا۔ ایک ایسا بچہ جو پوری دنیا کے سامنے عارفین اور زونکہ کا بچہ کہلاتا۔ اس بچے کی ماں چاہے کوئی بھی ہوتی لیکن باپ عارفین ہی ہوتا اور اس پلان کے لئے انہیں اب صبر کی ضرورت تھی اور عارفین کو اپنی مٹھی میں لینے کی۔



ڈاکٹر نے آپریشن کے دو ہفتے بعد بہروز بھائی کو ڈسچارج کر کے گھر بھیج دیا تھا لیکن یہ تاکید تھی کہ انہیں مکمل آرام اور بیڈ ریسٹ کی اشد ضرورت ہے، اور علاج کے دوران ذرا سی بھی بے احتیاطی یا پھر بد پرہیزی ان کی جان خطرے میں ڈال سکتی ہے لہذا وہ لوگ ان کا پورا پورا خیال رکھیں گے اور حد سے زیادہ احتیاط سے کام لیں، اور ایسے میں اروئی نے ڈاکٹر کو پورا یقین دلا دیا تھا کہ وہ بہروز بھائی کا بھرپور طریقے سے خیال رکھیں اور پورا علاج کروائیں گے۔ اروئی کی ہمت حوصلہ اور یقین دیکھ کر ایک پل کے لئے تو امی کو بھی اپنی اتنی بہادر اور باہمت بیٹی پہ رشک آیا تھا اور خود پہ فخر محسوس ہوا تھا کہ وہ اس کی ماں ہیں۔ جس روز وہ ڈسچارج ہو کر گھر آئے وہ لوگ بہت خوش تھے۔

”مبارک ہو بھئی آج بھائی صاحب گھر آ گئے ہیں۔“ جرار باقاعدہ انہیں مبارکباد دینے لگا تھا۔

”خیر مبارک بیٹا اللہ تمہیں بھی زندگی دے، آؤ بیٹھو.....“ امی آج بہت خوش تھیں اور ان کی خوشی ان کے لہجے ان کی آواز سے ہی بھلک رہی تھی۔

”میں ذرا بھائی صاحب کے پاس بیٹھتا ہوں۔“ وہ امی کے برابر کرسی چھوڑ کر بہروز بھائی کے قریب آ بیٹھا تھا۔



”سلام بھائی صاحب کیسی طبیعت ہے اب؟ کیسا ٹیل کر رہے ہیں؟“ وہ بیٹھتے ہی شروع ہو چکا تھا۔

”اللہ کا شکر ہے، ابھی تک تو بہتر ہوں۔“ بہروز بھائی کے لہجے میں غیر محسوس سی اداسی تھی ان کے چہرے پہ فکر کے سائے تھے، جب تک وہ ہسپتال میں رہے ان کا ذہن جاگا سو یا سارہا تھا اور ان کی سوچیں بھی منتشر اور بے ربط سی رہی تھیں لیکن گھر آ کر جیسے سب کچھ ٹھہر گیا سوچیں، خیالات اور فکریں ایک ہی مرکز پہ رک گئی تھیں کہ بستر پہ پڑے ہیں اور ان کی ماں ہمیشہ فکروں میں گھری ہوئی ہیں۔ یہ گھر جو پہلے صرف اور صرف ان کے بل بوتے پہ چل رہا تھا اب..... اب اس گھر کا نظام کیسے چلے گا؟ کون سنبھالے گا پورے گھر کو؟ کیا بنے گا ان کے بیوی بچوں اور ماں، بہنوں کا؟ جبکہ دوسرا کوئی آسرا نہیں، سہارا بھی نہیں تھا۔

”سنا ہے اروئی نے جاب کر لی ہے اور کافی پرکشش سلیری مل رہی ہے اسے؟“ جرار کی بات پہ بہروز بھائی نے بری طرح چونک کر جرار کو دیکھا تھا اور چائے کی ٹرے لے کر آتی اروئی کے قدم کمرے کی چوکت میں ہی ٹھک کر رک گئے تھے اس نے غصے سے جرار کو دیکھا جو نہ جانے کہاں سے الٹی سیدیسی ہانکنے آ جاتا تھا اور بات کرتے ہوئے کوئی موقع محل بھی نہیں دیکھتا تھا۔

”اروئی نے جاب کر لی ہے؟“ بہروز بھائی پوچھ نہیں رہے تھے صرف دُہرا رہے تھے۔ لیکن ان کی آواز جیسے کہیں دور آرہی تھی ان کا لہجہ ڈوب سا گیا تھا۔

”بھائی آپ کے لئے یہ سوپ اور جرار صاحب آپ کے لئے یہ چائے.....“ اروئی نے اپنے آپ کو کمپوز کرتے ہوئے آگے بڑھ کے درمیانی میز پہ ٹرے رکھی اور کافی بناشت سے بولی تھی۔

”اروئی تم جاب.....؟“ بہروز بھائی نہ جانے کیوں کچھ بول نہیں پائے تھے۔

”جی بھائی مجھے تقریباً ایک ہفتہ ہونے والا ہے، میں نے جاب کر لی ہے آپ کو اس لئے نہیں بتایا تھا کہ آپ کی طبیعت بھی اتنی ٹھیک نہیں تھی۔ سوچا آپ گھر آ جائیں گے تو بتا دوں گی، امی نے بھی منع کیا تھا بتانے سے۔“ اروئی نے بات کرتے ہوئے اپنے لہجے کو بہت ہی نارمل رکھا تھا تاکہ وہ کوئی ٹینشن نہ لیں۔

”لیکن بیٹا.....“

”پلیز بھائی آپ مجھے بیٹا کہتے ہیں تو مجھے اپنا بیٹا ہی سمجھیں۔ میں آپ کی بہن نہیں آپ کا بھائی، آپ کا بیٹا ہوں۔“ اروئی قریب بیٹھے جرار کو یکسر نظر انداز کئے اپنے بھائی کا ہاتھ تھامے انہیں تسلی دے رہی تھی۔

”لیکن بیٹا تم ابھی بہت کم عمر ہو، تمہیں کیا پتہ دنیا کیسی ہے؟“ وہ کمزور سے لہجے میں بولے تھے۔

”بھائی میں دنیا کو دیکھوں گی تو مجھے پتہ چلے گا نا کہ دنیا کیسی ہے؟ دنیا کو جاننے اور سمجھنے کے لئے دنیا کا سامنا کرنا، دنیا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنا بے حد ضروری ہوتا ہے۔ میں بھی دنیا کو دیکھنے نکل چکی ہوں بس آپ میرے لئے دعا کیجئے۔

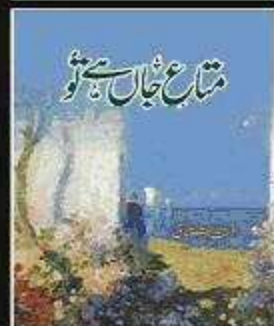
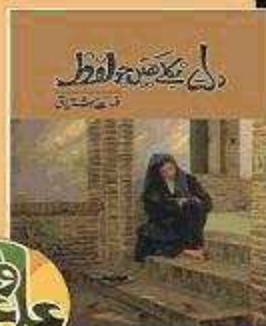
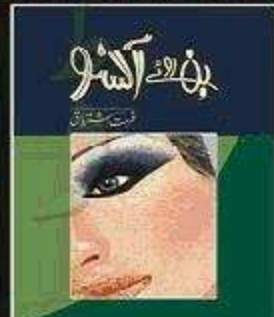
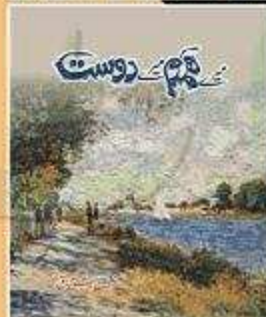
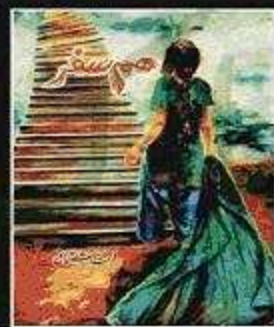
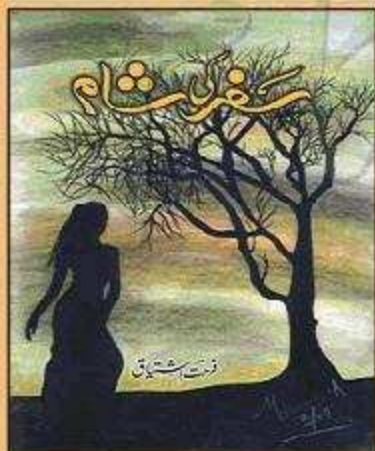
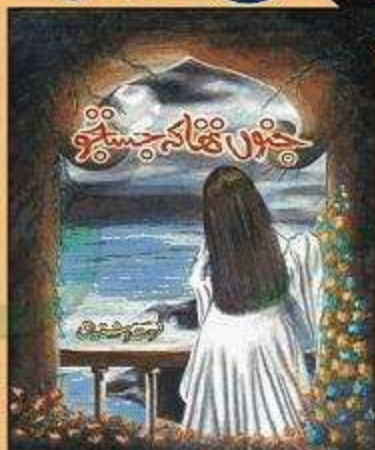
ویسے بھی میں نے کونسا عمر بھر کے لئے جاب کرنی ہے۔ آپ ٹھیک ہو جائیں گے تو میں فوراً جاب چھوڑ دوں گی۔“ وہ کہتے کہتے آخر میں

ہلکے سے مسکرائی تو وہ جواباً چپ ہو گئے اور روئی کو اشارہ کر کے اپنے کندھے سے لگا لیا تھا وہ کچھ مطمئن سے ہو گئے تھے جرات اٹھ کر خاموشی سے باہر آ گیا تھا۔



# پاکستان کی نامور ناول نگار بڑے سائز میں فرحت اشتیاق کی کتب نئے اضافوں کے ساتھ نئے ایڈیشن

2 نئے ناول



علم و فن پبلشرز

الحمد مارکیٹ، 40- اردو بازار، لاہور  
فون: 7223584، 7232336، 7352332  
www.ilmoirfanpublishers.com  
E-mail: ilmoirfanpublishers@hotmail.com





بی بی جان کی طبیعت اتنے دنوں سے سنبھل نہیں پاری تھی اس لئے بابا جان انہیں شہر لے آئے تھے اور عارفین جی جان سے ان کی دیکھ بھال میں لگا ہوا تھا۔ بابا جان پوتے کی اتنی فکر مندی اتنی محبت اور توجہ دیکھ کر بہت خوش تھے کہ کم از کم ان کے پوتے کو تو اپنے دادی، دادا کی فکر ہے نا۔

”بابا جان آج چار بجے کا ٹائم لیا ہے ڈاکٹر سے، بی بی جان کے چیک اپ کے لئے بھل جو شوگر کے ٹیسٹ کروائے تھے آج ان کی بھی رپورٹ مل جائے گی۔“ وہ صبح آفس جانے کے لئے تیار ہو کر نیچے آیا تو پہلا سامنا بابا جان سے ہی ہوا تھا۔

”جیتے رہو بیٹا اللہ تمہیں خوش رکھے۔“ بابا جان عارفین کو سرتا پادکچہ کر بولے تھے لیکن لہجہ کچھ بھیگ سا گیا تھا وہ شاید عارفین کے قد کاٹھ میں اور نین نقوش میں اس وقت اپنے بیٹے کی جھلک تلاش کر رہے تھے، اور پوتے میں بیٹے کی شبیہ پا کر ان کی پلکوں کے کنارے ہی نہیں آواز بھی بھیگ گئی تھی۔ بابا جان اور بی بی کو آج تک بیٹے کی جدائی پہ صبر نہیں آیا تھا شاید اس لئے کہ ان کا بیٹا زندہ سلامت ان سے جدا ہوا تھا اگر ان کا بیٹا مر گیا ہوتا تو شاید اسے مردہ سمجھ کر ہی انہیں صبر آ جاتا..... اور یہ روایت تو ازل سے چلی آرہی ہے کہ انسان صرف موت پہ صبر کرتا ہے۔ زندگی نہیں۔

”بابا جان کیا دیکھ رہے ہیں۔“ عارفین واپس پلٹنے لگا تھا مگر ان کی محویت دیکھ کر ٹھہر گیا تھا۔

”کچھ نہیں بیٹا تم آفس جاؤ۔“ وہ اپنے دل کے کمزور جذبات کو سنبھالتے ہوئے سنبھل گئے تھے۔

”او کے اللہ حافظ۔“ وہ کہہ کر پلٹ گیا لیکن ذہن بابا جان کی بھیگی آنکھوں کے احساس میں اٹکا ہوا تھا ڈرائیونگ کے دوران بھی وہ بابا جان کے دکھ کو خود پہ طاری کئے ان کی کیفیت اور جذبات کے متعلق سوچتا ہوا کافی سنجیدہ لگ رہا تھا کہ اچانک وہ بری طرح چونک گیا اور فوراً ہی گاڑی سنبھالتے ہوئے بریک لگائے تھے کوئی لڑکی اچانک سامنے آ گئی۔ عارفین نے غصے سے تمللا کر اس لڑکی کو دیکھا جو اتنی عجلت کا مظاہرہ کرتی اتنا خطرناک رسک لے رہی تھی۔

”میڈم آپ پاگل تو نہیں ہیں؟“ وہ یکدم دروازہ کھول کر باہر نکل آیا تھا اور اس کی آواز پہ اپنا بیگ سنبھالتی ارووی بھی چونک گئی تھی۔

”سر آپ؟“ اس نے حیرانی سے دیکھا جبکہ عارفین بھی اپنی جگہ پہ اسی طرح حیران کھڑا تھا۔

”مس ارووی مجھے لگتا ہے آپ ایک روز مجھے جیل بھیج کر ہی دم لیں گی۔“ عارفین نے ایک سیڈنٹ کی سمت اشارہ کیا تھا اور ارووی سچ مچ اپنی غلطی پہ شرمندہ ہو گئی تھی۔

”سوری سر! میں ان فیکٹ آفس جانے کی جلدی میں تھی۔“

”اوہ تو پھر آئیے آپ کو آفس چھوڑ دوں آپ لیٹ ہو رہی ہیں۔“ اس نے آفر کی تھی۔

”تو تھینکس سر میں چلی جاؤں گی۔“ اس نے فوراً انکار کر دیا تھا۔

”آپ میرے ساتھ نہیں جائیں گی تو مزید لیٹ ہو جائیں گی کیونکہ میں آپ سے پہلے پہنچ جاؤں گا جبکہ آپ کا مجھ سے پہلے آفس پہنچنا زیادہ ضروری ہے لہذا بہتر یہی ہے کہ آپ میرے ساتھ چلیں کیونکہ اکٹھے جانے سے کوئی بھی لیٹ نہیں ہوگا۔“ عارفین کی دلچسپ وضاحت اور آفر پہ ارووی کو ذرا دیر کے لئے سوچنا پڑا تھا، اور اس کو سوچ میں دیکھ کر عارفین نے آگے بڑھ کے فرنٹ ڈور کھول دیا تھا۔



”دیکھئے حمید صاحب! جب تک میرا کراچی والا پروجیکٹ مکمل نہیں ہو جاتا، میں مری والے پروجیکٹ پہ ہرگز کام نہیں کروں گا، میں جو بھی کام کرتا ہوں پوری ایمانداری اور محنت سے کرتا ہوں، میں صرف پیسہ کمانے کے چکر میں نہیں ہوں، میرا ایک نام ہے، ایک معیار ہے اور اپنے معیار کو قائم رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ میں کام پہ خود دھیان دوں اور مری والے پروجیکٹ پہ کام کرنا ایک بہت ہی حساس پروجیکٹ پہ کام کرنے کے مترادف ہے۔ انشاء اللہ جتنا ٹائم میں نے آپ کو دیا ہے اس ٹائم پہ آپ کو اپنا پلازہ تیار ملے گا اور ویسے بھی مری میں میرا ایک اور پروجیکٹ بھی شروع ہونے والا ہے۔“ عارفین اپنے کلائٹ سے کافی تفصیلی بات کر رہا تھا اور اس کے قریب رکھی چیئر پہ بیٹھی اروئی اس گفتگو کو بے حد غور سے سن رہی تھی۔

”لیکن شیرازی صاحب کچھ اندازہ تو ہو کہ آپ کام کب شروع کر رہے ہیں؟“ حمید صاحب کچھ غلت دکھا رہے تھے۔

”حمید صاحب میں تمام ضروری میٹریل کی بنگلہ کروا چکا ہوں، ایک دو چیزیں اور ارنج کرنا باقی ہے، لیکن انشاء اللہ ایک ماہ تک مجھے پوری امید ہے کہ کام شروع ہو جائے گا۔“ اس نے انہیں پوری تسلی دی تھی، اور پھر مزید معاملات طے کرنے کے بعد وہ اٹھ کر چلے گئے تھے۔

”مس اروئی میں بہت دنوں سے آپ کو انفارم کرنا چاہ رہا تھا کہ مجھے چند دن تک مری جانا پڑے گا اور وہاں کچھ ہفتے کا قیام بھی ہوگا۔ تو پھر آپ کیا کریں گی؟ آپ کے گھر والے آپ کو شہر سے باہر جانے کی اجازت دے دیں گے؟“ عارفین نے اپنی چیئر گھماتے ہوئے اچانک اروئی کی سمت رخ کیا تھا اور وہ اس کے سوال پہ ایک دم سے پریشان ہو گئی تھی۔

”لیکن سر میں کیسے آپ کے ساتھ؟“

”مس اروئی حیات آپ میری پی اے ہیں اور آپ کا میرے ساتھ ہونا اس جاب کا حصہ ہے، اور اسی اونچ نیچ کو مد نظر رکھتے ہوئے میں نے انٹرویو کے دوران آپ سے سوال بھی کیا تھا، اور آپ کا کہنا تھا کہ آپ یہ ذمہ داری نبھاسکتی ہیں۔ لہذا آپ کا کوئی بھی جواز سامنے رکھنا بے کار ہے۔“ عارفین نے اپنی طرف سے بات ہی ختم کر ڈالی تھی اور وہ مزید مشکل اور پریشانی میں گھر گئی تھی۔

”سر آپ جانتے تو ہیں کہ میرے گھر میں.....“ اس سے پہلے کہ اروئی بات مکمل کرتی اچانک پورے استحقاق سے دروازہ کھول کر رابعہ شیرازی دندان قباہی ہوئی اندر آ گئی تھیں۔

”مام آپ یہاں۔“ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”گھر میں تمہارے بابا جان اور بی جان نے جو قبضہ کر رکھا ہے اس لئے تم سے بات کرنے کے لئے تو آفس ہی آنا پڑے گا۔“ رابعہ شیرازی کے ناگوار لب و لہجے پہ عارفین شپٹا گیا تھا۔ اس نے فوراً اروئی کو دیکھا، وہ کافی الجھی ہوئی اور حیران نظر آ رہی تھی۔

”مام پلیز کیا کہہ رہی ہیں آپ؟ یہ آفس ہے، میرا کچھ تو خیال کریں۔“ وہ خفگی سے بولا تھا۔

”تمہارے بابا جان کچھ خیال کر رہے ہیں کیا؟ انہوں نے اچھی بھلی زندگی اجر ن کر کے رکھ دی ہے۔ آخر ایسی کونسی قیامت ٹوٹ پڑے گی اگر زولدا اور تمہارا بچہ نہیں ہوگا تو؟“ وہ تو جیسے پھٹ پڑی تھیں اور اروئی ان کی گفتگو پہ شرمندہ سی ہو گئی تھی۔

”اوکے سر میں چلتی ہوں، بعد میں آ جاؤں گی۔“ وہ فوراً اجازت طلب کرتی ہوئی پلٹ گئی تھی اور عارفین اپنا سر تھام کر رہ گیا تھا، اب یہ نوبت آ گئی



تھی کہ گھر کے مسئلے افس تک آ گئے تھے۔

”مام یہ مسئلہ ہم آرام سے بیٹھ کر بھی سلجھا سکتے ہیں۔“ عارفین کوچ کوچ اروئی کے سامنے اپنی ماں کے لب و لہجے اور گفتگو پہ سکی محسوس ہوئی تھی۔  
 ”یہ مسئلہ صرف ہم سلجھانا چاہتے ہیں، لیکن تمہارے بابائیں، وہ چاہتے ہیں کہ انہیں زونلہ میں کوئی نقص نظر آئے اور وہ اپنی چیتی مہر النساء بیگم کی بیٹی کو بیاہ کر لے آئیں۔ میں ان کے سارے پلان کو سمجھتی ہوں، آج کل اسی لئے وہ گاؤں چھوڑ کر شہر رہنے کے لئے آئے ہوئے ہیں، تاکہ تم پہ نظر رکھیں اور تمہیں ورغلا سکیں۔“ رابعہ شیرازی چنگاریاں چھوڑ رہی تھیں۔

”مام پلیز ایسی کوئی بات نہیں ہے، جیسا آپ سمجھ رہی ہیں، مہر النساء آنٹی کی بیٹی.....“

”شٹ اپ میرے سامنے اس کمینی، منحوس، جادوگرنی کو کبھی بھی آنٹی مت کہنا۔“ عارفین ان کے ہدیانہ انداز یہ حیرت زدہ انہیں دیکھتا رہ گیا تھا۔  
 ”اور ہاں اتنا یاد رکھنا تم اگر دوسری شادی کرو گے تو میری پسند سے، ورنہ دوسری صورت میں تم میرا مراہوا منہ دیکھو گے۔ میں کسی بھی لڑکی کو تمہاری دوسری بیوی اور زونلہ کی سوتن کے روپ میں دیکھ سکتی ہوں، مگر مہر النساء کی بیٹی کو نہیں۔ کسی قیمت پر بھی نہیں۔“ وہ کرسی دھکیل کر کھڑی ہو گئی تھیں اور عارفین کے دیکھتے ہی دیکھتے وہ آندھی طوفان کی طرح کمرے سے بھی نکل گئی تھیں۔

”اف خدا یا..... ان دو لوگوں کی جنگ اور ضد میں میرا وجود کہاں ہے؟ میرے جذبات، میرے احساسات کہاں ہیں؟ یہ لوگ میری ذات کو کیوں چکی میں پیس رہے ہیں؟“ وہ بالوں میں ہاتھ پھنسا کر بری طرح الجھ گیا تھا۔ اس کا ذہن ماؤف ہونے لگا تھا، وہ نہ جانے کیوں آفس سے اٹھ کر باہر نکل آیا تھا۔

”سنئے سروہ سز ہمانی آپ سے ملنے.....“ اروئی پیچھے سے پکارتی رہ گئی، لیکن وہ کچھ بھی سننے بغیر سیڑھیاں اتر گیا تھا۔ اس وقت اسے سب کچھ برا لگ رہا تھا بہت برا۔



رات کا نہ جانے کونسا پہر تھا جب ان کے کمرے کا دروازہ دھڑ دھڑایا گیا۔

”اروئی، سارہ جلدی آؤ، تمہارے بھائی کی طبیعت بہت خراب ہے۔“ بھابی کی گھبرائی بوکھلائی سی آواز ان کے اعصاب پہ ہتھوڑے کی مانند برسی تھی اور وہ تینوں ماں، بیٹیاں یک دم ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھی تھیں، اور پھر رات کے دو بجے ان کے گھر میں بھگدڑ سی مچ گئی تھی۔ فوراً ایسولینس کو کال کی گئی اور وہ روتے دھوتے انہیں لے کر بمشکل ہسپتال پہنچی تھیں۔ بہروز بھائی دل کا دورہ پڑتے ہی بے ہوش گئے تھے، لیکن ان کو دیکھ کر ہی ان کی اذیت ناک حالت کا اندازہ ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر ز انہیں فوری آئی سی یو میں لے گئے تھے اور کچھ ہی دیر میں ان کی مزید ٹریٹ منٹ شروع ہو گئی اور پھر صبح کے قریب ڈاکٹر ز نے انہیں روح فرسا خبر سنائی تھی۔ جس کو سن کر وہ سبھی ساکت ہو گئی تھیں۔

”بائی پاس؟“ امی زریلب دُہرا کر بولی تھیں اور اگلے ہی لمحے وہ خود بھی زمین بوس ہو گئی تھیں۔



دو، تین روز سے بی بی جان کی طبیعت کافی بہتر تھی۔ اس لئے وہ واپس گاؤں جانے پہ اصرار کر رہی تھیں اور آج ان کی ضد پہ بابا جان انہیں لے کر واپس جا رہے تھے، لیکن جانے سے پہلے وہ عارفین سے حتمی بات کرنا چاہتے تھے، جبکہ رابعہ شیرازی بھی تاک میں بیٹھی تھیں کہ وہ لوگ ابھی تک گئے کیوں نہیں؟ تھوڑی دیر بعد عارفین تیار ہو کر نیچے آیا تو بابا جان فوراً ہی متوجہ ہوئے تھے۔

”لگتا ہے آج کافی گہری نیند سوئے تھے جیسی آفس سے بھی لیٹ ہو گئے ہو؟“ انہوں نے اخبار رول کرتے ہوئے پوچھا۔

”میں آج سویا ہی نہیں تھا، اس لئے لیٹ ہو گیا ہوں۔“ اس کا لہجہ بے حد سنجیدہ اور گھمبیر تھا۔

”کیوں خیریت؟ کیوں نہیں سوئے تھے؟“ بابا جان متفکر سے ہوئے تھے۔

”بس ایسے ہی..... کچھ سوچتے ہوئے رات گزر گئی۔“ وہ چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے آہستگی سے بولا تھا۔

”ہوں..... اچھی بات ہے، کبھی کبھی سوچ سے بھی کام لے لینا چاہیے، ہم بھی کچھ سوچ رہے تھے، اسی لئے تمہارے اٹھنے کا انتظار کر رہے

تھے۔“ بابا جان عارفین کا سنجیدہ موڈ دیکھ کر مطمئن تھے کہ بات حتمی اور اچھے طریقے سے ہو جائے گی۔

”میرا انتظار؟“ اس نے کپ ٹیبل پہ رکھ دیا تھا اور انہیں سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”ہاں ہم جاننا چاہتے ہیں کہ تم نے ہماری قسم، ہمارے فیصلے کے بارے میں کیا سوچا ہے؟ کیا ارادہ ہے اب؟“ بابا جان کی بات پہ عارفین

کا دماغ گھوم کے رہ گیا تھا۔ اس کی زندگی، اس کا آرام و سکون بس اس سوال کی نذر ہو کے رہ گیا تھا۔ کتنے ہی لمحے وہ خاموش بیٹھا اپنے اندر کے ابال کو کنٹرول کرنے میں لگا رہا تھا۔

”تم چیپ کیوں ہو گئے عارفین؟“ انہوں نے اسے بولنے پہ اکسایا تھا۔

”بابا جان کیا آپ اپنی اس قسم، اس ضد کا دامن چھوڑ نہیں سکتے؟“ اس کا لہجہ بہت دھیمہ مگر تحکین زدہ تھا۔ وہ اپنی ماں اور دادا جان کی

سالوں پرانی جنگ کے ہاتھوں بری طرح تھک چکا تھا۔ ان لوگوں نے ہمیشہ صرف اپنے لئے سوچا تھا، کبھی عارفین کی ذات کی پروا ہی نہیں کی تھی اور وہ ان لوگوں کو اپنی ذات کا مان دیتے ہوئے ان کی ہر اچھی، بری بات بھی مانتا چلا جاتا تھا، لیکن وہ پھر بھی اس کا احساس نہیں کرتے تھے۔

”کیا تم ہمیں بے نام و نشان کرنا چاہتے ہو؟ کیا تمہارے دل میں بھی اب اپنے باپ جیسی سرکشی سرابھارنے لگی ہے؟ یا پھر صاف صاف

کہو کہ تم باپ نہیں بن سکتے؟ تمہارے ساتھ کوئی مسئلہ ہے، کوئی پرالیم ہے تمہیں، تم ہماری خواہش پوری کرنے سے اور اپنی نسل آگے بڑھانے سے

قاصر ہو؟“ بابا جان آج پہلی بار عارفین پہ اس قدر مشتعل اور غصہ ہوئے تھے اور اتنی شدت سے ہوئے کہ وہ عارفین کی مردانگی کو بھی ٹھیس پہنچانے سے باز نہیں آئے تھے، وہ ان کے طعنے کی چوٹ سے بلبلہ کے رہ گیا تھا۔

”پلیز بابا جان یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟“ عارفین کی مردانگی پر..... بہت کاری ضرب لگی تھی۔

”ٹھیک کہہ رہے ہیں ہم..... تم ہماری خواہش پوری کرنے سے کتر اکیوں رہے ہو؟ مرد ہو تو دوسری شادی کرو اور ہمیں اولاد دو، ہم تر سے

بیٹھے ہیں، ہمیں زندہ رہنے کے لئے کسی خوشی، کسی سہارے کی ضرورت ہے، ہم اپنی نسل کو ختم ہوتے نہیں دیکھ سکتے، تمہیں کوئی نہ کوئی فیصلہ کرنا ہی ہو



گا۔ اگر دوسری شادی نہیں کرنا چاہتے تو ٹھیک ہے نہ کرو، مگر پھر اپنی بیوی سے کہو کہ وہ تمہارے بچے کی ماں بنے، ہمیں وارث دے، اسے ڈاکٹر کے پاس لے جاؤ، علاج کرواؤ، چاہے انگلینڈ لے جاؤ اور اس کے لئے سارا خرچہ ہم انورڈ کریں گے۔“ بابا جان اس بار کوئی بھی چھوٹ دینے کو تیار نہیں تھے اور دوسری طرف رابعہ شیرازی بھی جیسے سر، دھڑکی بازی لگائے بیٹھی تھیں، عارفین ان لوگوں کے درمیان محض ایک فٹ بال بن کے رہ گیا تھا۔ اس کے اعصاب اتنے شل ہو رہے تھے کہ وہ چپ چاپ وہاں سے اٹھ کر چلا گیا، آج پہلی بار وہ جاتے ہوئے بی بی جان سے بھی نہیں ملا تھا اور بغیر سوچے سمجھے ہی اسلام آباد کے لئے روانہ ہو گیا۔



”منیجر صاحب آپ کا عارفین سر سے رابطہ ہوا کوئی؟“ اروئی نے بہت بے چینی سے پوچھا تھا۔ اسے آج تیسرا دن تھا، وہ مسلسل عارفین شیرازی کے سیل فون پر رابطہ کر رہی تھی۔ مگر اس کا سیل مسلسل ہی آف جا رہا تھا۔ اس نے عارفین کے گھر بھی کال کی تھی۔ وہاں سے بس یہ پتہ چلا تھا کہ وہ شاید اسلام آباد گئے ہیں۔ اب اسلام آباد میں وہ کہاں ہیں؟ کیوں گئے ہیں؟ موبائل کیوں آف ہے؟ یہ کسی کو بھی پتہ نہیں تھا۔ وہ اروئی جس کے پاس ان کے پل پل کی خبر اور آنے جانے کی پوری لسٹ ہوتی تھی آج وہ بھی بے خبر تھی اور ان کی تلاش میں ماری ماری پھر رہی تھی۔ اسے یقیناً عارفین کی غیر موجودگی سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا، لیکن اس کا بھائی ہسپتال کے آئی سی یو میں موت اور زندگی کی جنگ لڑ رہا تھا اور اس جنگ میں زندگی کی فتح کے لئے روپے کی سخت ضرورت تھی اور روپے کی خاطر جھوٹی پھیلائے کے لئے عارفین شیرازی کی موجودگی بھی بے حد ضروری تھی۔ اپنے بھائی کی زندگی کے لئے اللہ کے بعد اسے صرف عارفین پر امید تھی، لیکن وہ تھا کہ مل کے نہیں دے رہا تھا۔ نہ جانے کہاں بڑی ہو گیا تھا۔ حالانکہ اروئی نے منیجر صاحب سے کچھ رقم آفس کی طرف سے ایڈوانس لینے کی بھی بات کی تھی۔ مگر منیجر صاحب اپنے پاس کی اجازت اور موجودگی کے بغیر کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔

”منیجر صاحب آپ چپ کیوں ہو گئے ہیں؟ پلیز بتائیے نا۔ سر سے رابطہ ہوا آپ کا؟ وہ کہاں ہیں؟“ اروئی کا لہجہ تین دن کی مسلسل خواری اور بھائی کی تکلیف اور اذیت کا سوچ کر روہانسا ہو گیا تھا، جبکہ اس کی پریشانی اور شکل دیکھ کر منیجر صاحب اپنی جگہ پر بہت شرمندہ اور چپ سے ہو گئے تھے۔

”سوری میم آج بھی ان سے کوئی رابطہ نہیں ہوا، ہو سکتا ہے وہ کسی گھریلو کام یا مسئلے کی وجہ سے کہیں کام سے گئے ہوں، ایسے میں ان کی وائف یا پھر مدد کو ہی پتہ ہو سکتا ہے کہ وہ کہاں ہیں؟“ منیجر صاحب بات کرتے ہوئے بہت شرمندہ ہو رہے تھے۔ انہیں اروئی کی پریشانی کا بخوبی اندازہ تھا، لیکن وہ خود سے کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ سوائے چند ہزار کی مدد کے۔

”تو کیا میں ان کے گھر جا کے ان کا پتہ کر سکتی ہوں؟“ اروئی کے ہیکے لہجے میں بے تابی تھی۔

”ہاں کیوں نہیں۔ پتہ کرنے میں کیا حرج ہے؟“ منیجر صاحب نے ہاں میں ہاں ملائی تھی اور وہ اپنے گرتے ہوئے حوصلوں کو پھر سے کھڑا کرتی تیزی سے مڑ گئی تھی، عارفین کے گھر جانے کے لئے۔



”مام یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟“ زونکہ، رابعہ شیرازی کی بات سن کر حیران رہ گئی تھی۔

”ایسا ہو سکتا ہے اور..... ایسا ضرور ہوگا، تم دیکھنا میں سب کی خواہش، سب کی ڈیمانڈ پوری کروں گی، بابا جان کو ان کا ”وارث“ مل جائے گا، عارفین کو اپنی اولاد“ پالنے کا موقع ملے گا اور تم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سوتن کے خطرے سے نکل آؤ گی اور عارفین کی بیوی بن کے اس گھر پہ راج کرو گی اور رہی مہر النساء تو وہ..... ایک بار پھر زندگی میں ناکام بیٹی اپنے زخم چاٹتی رہ جائے گی، اور ہمیشہ کی طرح ایک بار پھر کامیابی میرے سامنے کھٹے ٹیک دے گی۔ پھر میں دیکھوں گی کہ بابا جان تمہیں ناگواری نظروں سے کیسے دیکھتے ہیں؟ دیکھنا زونکہ یہ بچہ تمہیں تخت پہ بٹھا دے گا۔ بی بی جان اور بابا جان تمہارے آگے پیچھے پھیریں گے۔ تم اس بچے کی ماں ہی نہیں بلکہ ملکہ کہلاؤ گی۔“ رابعہ شیرازی کا چلان بہت طویل اور بہت سنگین تھا۔ زونکہ ڈانواں ڈول تھی۔ مگر رابعہ شیرازی اپنے فیصلے، اپنے آئیڈیے پہ قائم تھیں۔

”لیکن مام کیا کوئی لڑکی اس کام کے لئے رضامند ہو جائے گی؟“

”میری جان پیسہ ہر ایک کو رضامند کر لیتا ہے۔ میری ایک دوست کا دارالامان ہے۔ وہاں بہت سی لڑکیاں ہیں، ضرورت مند بھی ہیں اور کچھ رنگین مزاج بھی ہیں، بس کسی ایک کو قابو میں کر کے اپنا کام اور اس کا کام کروالیں گے۔“ رابعہ شیرازی بالکل تیار اور مطمئن بیٹھی تھیں۔

”اور عارفین؟“ زونکہ ہر پوائنٹ ڈھونڈ کے لارہی تھی۔

”اس کی رضامندی تم مجھ پہ چھوڑ دو۔“

”السلام علیکم میڈم، کیا میں اندر آ سکتی ہوں؟“ اچانک ڈرائنگ روم کے داخلی دروازے سے آواز ابھری تھی۔ ان دونوں نے حیرت سے مرکز دیکھا تھا۔

”میڈم میں عارفین سر کی پی اے ہوں۔“ اروی ان کی سوالیہ نظریں دیکھ کر فوراً بولی تھی۔

”ہوں! آؤ، آؤ اندر آ جاؤ۔“ رابعہ شیرازی چونک سی گئی تھیں۔ انہوں نے اس لڑکی کو عارفین کے آفس میں بھی دیکھا تھا، اور شاید اس کے ساتھ کہیں اور بھی دیکھا تھا۔ اروی اندر تو آ گئی تھی۔ مگر اب سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ سامنے شاہانہ انداز میں بیٹھی دونوں عورتوں سے کیا کہے؟

”بیٹیجیہ کیسے آتا ہوا آپ کا؟“ رابعہ شیرازی اس کا سر تاپا جائزہ لے رہی تھیں۔

”میڈم آج تیسرا روز ہے عارفین سر کا موبائل فون مسلسل آف ہے، ہم لوگ ان کے نمبر پہ ٹرائی کر کر کے تھک گئے ہیں، ان کا کوئی اتا پتا نہیں ہے، میں آپ سے پوچھنے کے لئے آئی ہوں کہ کیا آپ کا ان سے کوئی رابطہ ہے؟“ اروی اپنے حواس، اپنے اعصاب یکجا کرتے ہوئے مشکل بات مکمل کر پائی تھی۔ رابعہ شیرازی اسے بغور دیکھ رہی تھیں، جبکہ زونکہ اسے سرسری نظر سے دیکھ کر میگزین دیکھنے میں لگ گئی تھی۔

”کیوں کیا ضروری کام ہے اس سے؟ کوئی آفس پر ابلم وغیرہ؟“ انہوں نے سوال کیا تو اروی گڑبڑا گئی۔

”نہیں میڈم ایسی تو کوئی بات نہیں ہے، ہم تو بس.....“ وہ کچھ کہہ نہیں پائی تھی۔

”آپ لوگ پریشان مت ہوں، وہ جب بہت زیادہ ٹینس ہوتا ہے تو اسی طرح گھر سے چلا جاتا ہے، جب کچھ ریلیکس ہوگا تو فوراً آ جائے



گا، وہ جان بوجھ کر کسی سے بھی رابطہ نہیں کر رہا۔“ انہوں نے اروئی کو تسلی دی، مگر اروئی کو تو اس وقت کسی اور تسلی کی ضرورت تھی۔۔۔۔۔ مگر۔۔۔۔۔

”او کے میڈم۔ میں چلتی ہوں، اگر وہ آپ سے رابطہ کریں تو پلیز ان سے کہیے گا کہ پی اے سے رابطہ کر لیں۔“ اروئی تھکے تھکے مایوس قدموں سے واپسی کے لئے پلٹ گئی تھی۔ رابعہ شیرازی اسے تولتی ہوئی جا چٹتی ہوئی نظروں سے دیکھ کر پرکھ رہی تھیں۔

”سنو لڑکی! ادھر آؤ۔“ کافی حاکمانہ سا انداز تھا۔

”جی میڈم؟“ وہ بمشکل پلٹ کر ان کے سامنے آئی اور آنکھ کے کناروں تک آئے آنسو بھی بڑی مشکل سے واپس دھکیلے تھے۔

”تمہیں کوئی ذاتی کام ہے عارفین سے؟“

”جی میڈم۔“ وہ نہ جانے کیوں انکار نہیں کر پاتی تھی۔

”کیا کام ہے؟“

”میرے بڑے بھائی دل کے مریض ہیں، ان کے بائی پاس کے لئے رقم کی ضرورت ہے، اس لئے میں سر سے ایڈوانس لینے کے لئے آئی تھی۔ مگر وہ اتنے دنوں سے آفس ہی نہیں آئے اور ان کا موبائل بھی آف ہے، میں نے منیجر صاحب سے بھی کہا ہے، مگر انہوں نے انکار کر دیا ہے کہ وہ سر کی اجازت کے بغیر کچھ نہیں کر سکتے۔“ اروئی بغیر کے بولتی چلی گئی تھی۔

”اتنی بڑی رقم تو میرا خیال ہے کہ عارفین بھی نہیں دے گا، وہ بھی کسی گارنٹی کے بغیر۔“ رابعہ شیرازی کے شاطرانہ دماغ نے پل میں کروٹ بدلی تھی اور اپنے نئے کھیل کے لئے مہرہ تلاش کیا تھا اور اس تلاش میں ان کی آنکھیں چمک اٹھی تھیں۔ کیونکہ ”ضرورت مند“ خود چل کے ان کے پاس آ گیا تھا۔ جبکہ وہ ضرورت مند کے پاس جانے سے بچ گئی تھیں۔

”میڈم پلیز، میں۔۔۔۔۔ میں کوئی بھی گارنٹی دینے کو تیار ہوں، پلیز مجھے اپنے بھائی کی زندگی سے بڑھ کر اور کچھ بھی نہیں ہے۔“ اروئی بے بسی کے ہاتھوں بے اختیار ہو گئی تھی اور اس نے عارفین کا مزید انتظار کئے بغیر رابعہ شیرازی کے سامنے جھوٹی پھیلا ڈالی تھی، اس وقت اگر اسے کسی کے قدموں میں گر کر بھیک بھی مانگنا پڑتی تو وہ مانگ لیتی۔ کیونکہ اس کی انا، اس کی عزت نفس سے زیادہ اس وقت بہروز بھائی کی زندگی اہم تھی۔

”جو میں کہوں گی وہ کرو گی؟“ رابعہ شیرازی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ ”شکار“ ان کے سامنے کھڑا تھا۔ بس اسے اپنے جال میں گھیرنے کی دیر تھی۔

”جی میڈم آپ جو کہیں گی میں کروں گی، بس میرے بھائی کا آپریشن۔۔۔۔۔“

”تمہارے بھائی کا آپریشن بھی ہوگا، تمہارے گھر کے اخراجات بھی پورے ہوں گے، تمہارے بھائی کا پورا پورا علاج ہوگا۔ جب تک ڈاکٹرز نے چاہا وہ ہسپتال میں ہی رہے گا۔ تمام بل میں خود ادا کروں گی، تمہیں پیسے کی کمی نہیں ہوگی، بس تمہیں کام میری پسند سے کرنا ہوگا، جیسا میں چاہوں گی ویسا ہی کرنا پڑے گا۔“ رابعہ شیرازی نے ”اروئی حیات“ کو خریدنے کے لئے اپنی امیری کا دکھول دیا تھا اور اروئی حیات اپنے بھائی کی زندگی کی خاطر اپنی غریبی، اپنی مفلسی اور اپنی پوری ذات سمیت کھڑے کھڑے کچھ بھی سوچے سمجھے بغیر امیری کے در پہ بک گئی تھی۔

”میڈم میں سب کچھ کرنے کو تیار ہوں، بس آپ بتادیں مجھے کیا کرنا ہوگا؟“ ارونی کو کچھ آس و امید کی کرن نظر آئی تو لہجہ کچھ سنبھل سا گیا تھا۔ رونق آگئی تھی اس کے چہرے پر۔

”تمہیں عارفین سے شادی کرنا ہوگی، محض کچھ عرصہ کے لئے..... صرف ایک بچے کے پیدا ہو جانے تک..... یہ شادی سب سے خفیہ ہو گی، کسی کو کچھ پتہ نہیں چلے گا۔ نہ تمہارے گھر والوں، نہ ہمارے خاندان کو، وہ بچہ زونلہ کا بچہ کہلائے گا۔ اس کی ماں زونلہ ہوگی۔“ رابعہ شیرازی بہت کچھ کہتی جا رہی تھیں، مگر ارونی کے قدموں سے جیسے کسی نے زمین کھینچ لی تھی۔ اس کے کانوں میں سائیں سائیں ہونے لگی تھیں۔ اس کی آنکھیں دھندلا گئی تھیں۔ اس نے بمشکل رابعہ شیرازی اور زونلہ شیرازی کے چہرے دیکھے تھے۔



”رکے مس ارونی!“ اپنا کام بٹا کر آفس روم سے باہر نکلتی ارونی کے قدم اس کی آواز پہ تھم گئے تھے۔ ”جی سر کہئے؟“ وہ آہستگی سے بولی چہرہ جھکا ہوا تھا۔

”آپ ٹھیک تو ہیں نا؟“

”جی سر میں ٹھیک ہوں۔“ وہ آج پورے دو ہفتے کے بعد آفس آیا تھا۔ وہ اس روز کسی کو بھی کچھ بتائے بغیر ٹینشن کی وجہ سے بے ارادہ ہی مری چلا گیا تھا اور جان بوجھ کر سیل آف کر دیا تھا کہ کوئی اسے ڈسٹرب نہ کرے۔ خصوصاً رابعہ شیرازی اور بابا جان، اور پھر مری والے پروجیکٹ کا سیٹ اپ کرتے کرتے ٹینشن بھی دور ہو گئی تھی اور اعصاب بھی کچھ بہتر ہو گئے تھے، جی آج صبح ہی ذرا فریش موڈ کے ساتھ واپس آ گیا تھا۔

”مس ارونی آپ کے بھائی کیسے ہیں؟ ان کی طبیعت ٹھیک ہے نا؟“ اس نے دُہرا کے پوچھا تھا۔ اسے ارونی کا مزاج، اس کے تیور، اس کا انداز بہت بدلے بدلے کترائے ہوئے اور کچھ کچھ شکوہ کنناں سے لگ رہے تھے۔ جی وہ اسے کرید رہا تھا۔

”جی اب وہ ٹھیک ہیں۔“ وہ دھیمے سے کہہ کر فوراً باہر نکل گئی تھی اور اندر داخل ہوتے منیجر صاحب سائیڈ پہ ہو گئے تھے۔ عارفین سوچ میں پڑ گیا تھا۔

”سلام سر۔ کیسے ہیں آپ؟“ منیجر صاحب نے اسے متوجہ کیا تھا۔

”والسلام بیٹھے۔“

”کیا سوچ رہے آپ؟“

”میں مس ارونی حیات کے متعلق سوچ رہا ہوں، کچھ ٹینس لگ رہی ہیں۔“ عارفین نے فوراً اظہار کیا تھا۔

”جی سر وہ تھوڑی سی ٹینس نہیں ہیں، وہ بہت زیادہ ٹینس رہی ہیں۔ دراصل ان کے بھائی کو پھر دل کا دورہ پڑ گیا تھا۔ ان کے ہارٹ کی کنڈیشن بہت دیک تھی۔ شاید لاسٹ اسٹیج پہ تھا۔ ڈاکٹرز نے بائی پاس تجویز کیا تھا، ان کے دل کی شریانوں میں خون پھر سے رک گیا تھا۔ ان کی حالت بہت خراب تھی اور مس ارونی بے حد پریشان تھیں۔ آپریشن کے لئے ان کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ آفس کی طرف سے کچھ رقم ایڈوانس لینے



کے لئے بھی آئی تھیں۔ مگر میں آپ کی اجازت کے بغیر ایسا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس لئے میں نے انکار کر دیا تھا۔ وہ اتنے دن آپ کے نمبر پہ بھی ٹرائی کرتی رہی تھیں۔ آپ کے گھر سے بھی آپ کا پتہ کیا تھا۔ مگر آپ سے کوئی رابطہ نہیں ہو سکا تھا۔“ منیجر صاحب کی بات پہ عارفین بری طرح پریشان ہو گیا تھا۔ اسے اروئی کی پریشانی اور مشکل وقت کا بخوبی اندازہ ہو گیا تھا۔

”پھر اب..... وہ کیسے ہیں؟ کیا ہوا ہے؟“ اس نے دھڑکتے دل سے پوچھا تھا کہ کہیں کوئی انہونی نہ ہو گئی ہو۔

”اب وہ کافی بہتر ہے، خطرے سے باہر ہیں اور ان کا بائی پاس بھی ہو چکا ہے۔“

”بائی پاس ہو چکا ہے؟ کب کہاں سے ہوا؟“ اس نے تیزی سے پوچھا۔

”شاید سبیل کراچی سے ”دی ہارٹ سینٹر“ سے ہوا ہے۔“

”اوہ پھر تو کافی مشکل کا سامنا کرنا پڑا ہوگا ان لوگوں کو؟“

”جی کافی سے بھی زیادہ مشکل وقت تھا ان لوگوں پہ، اللہ بھلا کرے اس آدمی کا جس نے ان کی میلپ کی ہے، ایک ہفتے بستے گھرانے کا چراغ بجھنے سے بچا لیا ہے۔“

”کس نے میلپ کی ہے ان کی؟“ اس نے چونک کر پوچھا تھا۔

”سریہ تو مجھے بھی نہیں پتہ، شاید اس آدمی نے اپنی نیکی پردے میں رکھنے کی کوشش کی ہے۔“ منیجر صاحب بھی اروئی کی طرف سے خاصے مشکور ہو رہے تھے۔ عارفین کو سب کچھ جاننے کے بعد بے حد افسوس ہو رہا تھا اور اپنے آپ پہ غصہ بھی آیا تھا کہ اتنے دن وہ گھر سے باہر رہا اور فون بھی آف رکھا۔ اگر ایسی لا تعلقی، ایسی لاپرواہی میں ہی اس کے پیچھے کسی کو کچھ ہو جاتا تو؟ اگر اس کے اپنے ہی گھر والوں کو کوئی مصیبت آن پڑتی، کوئی کام آن پڑتا تو پھر کیا ہوتا؟

اروئی صبح آفس جانے سے پہلے بہروز بھائی سے ملنے ہسپتال آئی تھی، لیکن آج گھر سے نکلتے نکلتے ہی وہ کافی لیٹ ہو گئی تھی اور پھر جیسے ہی وہ ہسپتال پہنچی اس کے قدم ٹھک کر رک گئے تھے، اور اس کے چہرے کی رنگت بھی بدل گئی تھی۔ بہروز بھائی کے قریب ہی عارفین شیرازی بیٹھا ہوا تھا اور بہروز بھائی کے سر ہانے سائیڈ ٹیبل پہ بڑا ساسرنگ گلابوں کا بکے رکھا ہوا تھا۔

”آؤ اروئی تم رک کیوں گئی ہو، دیکھو عارفین بیٹا آیا ہے۔“ امی نے خوشی خوشی بتایا تھا بھابی اور بھائی بھی بہت خوش اور مرعوب نظر آ رہے تھے، آخر اتنا امیر، کبیر اور مصروف آدمی خود ان کی عیادت کے لئے آیا تھا۔

”السلام علیکم!“ اروئی نے لٹھ مار سے انداز میں سلام کیا تھا۔ عارفین نے ایک بار پھر اروئی کے مزاج کی بیگانگی نوٹ کی تھی۔ وہ پہلے تو ایسی نہیں تھی۔ وہ تو خاصی خوش اخلاق تھی۔ بہت عزت سے، بہت احترام سے پیش آتی تھی، مگر اب..... اب وہ خاصی بدلی ہوئی لگ رہی تھی اور عارفین کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اس کا رویہ میرے ساتھ ایسا کیوں ہے؟ کیا وہ بغیر بتائے جانے پہ خفا ہے یا پھر کوئی اور خطا ہو گئی ہے؟“

”اروئی آپ کی بہت تعریف کرتی ہے، وہ بتاتی رہتی ہے کہ آپ بہت کیئرنگ اور سوفٹ نیچر کے ہیں، پہلے تو ہم صرف سنتے تھے۔ مگر اب

تو خود بھی یقین ہو گیا ہے کہ صرف آپ ہی نہیں آپ کی پوری فیملی ہی بہت اچھی ہے، آپ کی والدہ، آپ کی وائف بھی ماشاء اللہ بہت اچھے مزاج کی خاتون ہیں، اللہ آپ سب کو ہمیشہ خوش رکھے۔“ بہروز بھائی کی بات پہ عارفین بری طرح چونکا تھا۔

”میری والدہ اور میری وائف؟ ان کی ملاقات ان سے کب ہوئی؟“ اس نے الجھی ہوئی نظروں سے اروئی کی سمت دیکھا، مگر اروئی تو نظر ملانے سے ہی انکار ہی تھی آج کل۔

”تھینک یو بہروز صاحب آپ سے مل کر، آپ کی کمپنی میں بہت اچھا لگا۔ بس آپ جلدی سے ٹھیک ہو جائیں تو سارے مسئلے حل ہو جائیں گے، اوکے اب اجازت دیجئے میں آفس سے لیٹ ہو رہا ہوں۔“ وہ کہتے ہوئے کھڑا ہوا گیا تھا اور پھر بہروز بھائی سے ہاتھ ملا کر ان کا کندھا دبا دیا تھا۔ پھر امی اور بھابی سے اجازت لی اور جاتے جاتے صوفے پہ کھینچی سوئیا کو کچھ نوٹ تھما گیا تھا۔ اروئی سوئیا کے ہاتھ میں دبے نوٹ دیکھ کر اندر سے مشتعل ہی ہو گئی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کے سارے نوٹ چھین لئے اور لپک کر کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔ عارفین تب تک پارکنگ میں اپنی گاڑی کا لاک کھول رہا تھا۔

”سر آپ کے یہ روپے۔“ اروئی کی سخت آواز وہ گاڑی کا ڈور کھولتے کھولتے ٹھک گیا تھا۔ اس نے حیرت سے اس کے ہاتھ میں پکڑے روپے دیکھے تھے۔

”یہ میں آپ کو نہیں آپ کی بھتیجی کو دے کے آیا ہوں۔“  
 ”وہ بھتیجی آپ کی نہیں میری بھتیجی ہے، اس لئے میں لینے سے انکار کرتی ہوں آپ کی یہ عنایت نہیں چاہئے ہمیں۔“ اروئی کا لہجہ بہت سخت ہو رہا تھا اور بے مروت بھی۔

”یہ روپے میں نے اس لئے نہیں دیئے کہ آپ کو یہ چاہیے یا نہیں، بلکہ میں نے تو اس لئے دیئے ہیں کہ یہ میری خوشی ہے، میں پہلی بار سب سے ملنے آیا۔ مگر خالی ہاتھ، اس لئے سوچا جو میں نہیں لاسکا وہ بچی خود لے لے گی۔“ عارفین کو حیرت پہ حیرت ہو رہی تھی کہ وہ آخر ایسا کیوں کر رہی ہے؟

”وہ بچی لاوارث نہیں ہے اس کی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے ابھی اہم زندہ ہیں، فی الحال اس بھیک کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ اس نے زبردستی وہ روپے عارفین کو واپس تھما دیے تھے۔

”آپ ایسا کیوں کر رہی ہیں مس اروئی؟“  
 ”میں ایسا اس لئے کر رہی ہوں کیونکہ میں اتنا قرض نہیں چکا سکتی، مجھ میں اتنی سکت نہیں ہے کہ میں آپ کی پانی پانی کا حساب دے سکوں،

میں مزید نہیں بک سکتی، پلیز آپ اپنی عنایات اپنے تک رکھیں، میں نے جو آپ سے لینا تھا وہ لے لیا، اب اور نہیں۔“  
 وہ کہہ کر واپس مڑ گئی تھی اور عارفین حیران پریشان کھڑا رہ گیا تھا۔

وہ لڑکی جو ایک بار اس کی ذات پہ مان رکھ کر، اس پہ بھروسہ کر کے، ایک آس، ایک امید اور ایک یقین لے کر اس سے قرض لینے آگئی تھی،



آج اس کی خوشی سے دیئے ہوئے پیسوں کو قرض کا نام دے کر واپس ٹھکرا کے چلی گئی تھی، عجیب لڑکی تھی وہ؟ عارفین کے ذہن میں ابھی ریشم کی گتھی سلجھ ہی نہ رہی تھی کہ چکر کیا ہے آخر؟؟



”میں ایسا ہرگز نہیں کروں گا۔“ وہ اپنی ماں کا ترتیب دیا ہوا پلان سن کر یک دم غصے سے بھر گیا تھا۔

”مجھے سوچ سمجھ کر جواب دینا عارفین، کیونکہ اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو میں یہ گھر چھوڑ کر چلی جاؤں گی، بالکل اسی طرح جس طرح تمہارا باپ یہ گھر چھوڑ کر چلا گیا تھا، آج تک نہ وہ لوٹ کر واپس آیا ہے اور آئندہ کبھی نہ میں لوٹ کر واپس آؤں گی، تم پھر اپنے جیتے بابا جان کی ہر بات ماننا اور ہر بات پہ عمل کرنا، لیکن یہ بھول جانا کہ تمہاری کوئی ماں بھی تھی۔ پہلے تم باپ سے محروم ہوئے تھے، اب تم ماں سے محروم ہو جاؤ گے، اور یہ میرا آخری فیصلہ ہے، صبح تک اچھی طرح سوچ لو، ورنہ وہ دیکھو میرا بیگ تیار رکھا ہے، میں کسی بھی وقت کسی کو بھی بتائے بغیر گھر چھوڑ کر جاسکتی ہوں، کیونکہ میں مہر النساء سے کبھی بھی شکست نہیں کھا سکتی، چاہے مجھے گھر چھوڑنا پڑ جائے۔“ رابعہ شیرازی بیڈ پہ رکھے بیگ کی سمت اشارہ کر کے عارفین کو فیصلے کے چلتے کنویں میں دھکیل کر خود ہی اپنی کمرے سے باہر نکل گئی تھیں۔ عارفین وہیں صوفے پہ ڈھسے گیا تھا..... اس کی زندگی متاثرین کے رہ گئی تھی، وہ کیا کرتا؟ کہاں جاتا آخر؟



بہروز بھائی ڈسپارچ ہو کر گھر آچکے تھے اور پہلے سے کچھ بہتر تھے، اروئی ہمیشہ کی طرح اپنی جاب میں بڑی تھی، جب رابعہ شیرازی نے اسے نکاح اور روانگی کا وقت بتایا تھا۔ اروئی نے چند روز پہلے ہی گھر والوں کو باخبر کر دیا تھا کہ اسے جاب کے سلسلے میں میڈم اور باس کے ساتھ مری جا کر رہنا پڑے گا۔ وہاں ان کے دو نئے پروجیکٹ شروع ہو رہے ہیں، اس لئے پی اے ہونے کے ناتے اس کا جانا بھی ضروری تھا اور وہ انکار بھی نہیں کر سکتی تھی۔ گھر والے بھی اس جاب کی نوعیت اور گھر کے حالات سے بخوبی واقف تھے۔ لہذا کوئی بھی اسے جانے سے منع نہیں کر سکتا تھا اور ویسے بھی انہیں میڈم رابعہ شیرازی اور عارفین پہ پورا بھروسہ تھا کہ وہ لوگ بہت اچھے لوگ ہیں، اس کا دھیان رکھیں گے اور وہ محفوظ رہے گی۔

وہ اروئی کی طرف سے مطمئن تھے۔ اسی لئے جب آج اروئی نے اپنی بیکنگ شروع کی تو انہیں حیرانی نہیں ہوئی تھی۔

”بیٹا اپنے گرم کپڑے رکھ لو اور اپنے موبائل کا بھی دھیان رکھنا، ہم روزانہ فون کر کے تمہاری خیریت معلوم کر لیا کریں گے، اور سردی سے بچ کے رہنا، ورنہ بیمار پڑ جاؤ گی۔“ امی نے اس کے سامان کے ساتھ چند نصیحتیں بھی باندھ کے رکھنی شروع کر دی تھیں۔

”پھوپھو آپ واپس کب آؤ گی؟“ سونیا نے اس کا دوپٹہ پکڑ کر فکر مندی سے پوچھا تھا اور اروئی کو اس کا سوال دل پہ لگا تھا۔ سبھی اسے رخصت کر رہے تھے، جبکہ سونیا کو اس کی واپسی کی فکر تھی۔

”جب اللہ نے چاہا آ جاؤں گی۔“ وہ بہروز بھائی، ثمنینہ بھائی، سارہ اور امی کے گلے گلے کے رخصت ہوئی تھی۔

”میں آپ کی طرف سے خوشخبری کی منتظر رہوں گی۔“ اس نے ثمنینہ بھائی کی طرف اشارہ کیا تھا۔ وہ پریکٹسٹ تھیں۔ بس کچھ دنوں تک ان

کی ڈیوری متوقع تھی اور ان لوگوں کو بھیجی کی بہت خواہش تھی، اسی لئے دن رات بیٹے کی دعا کرتی تھیں۔

”انشاء اللہ سب سے پہلے تمہیں ہی بتائیں گے۔“ امی نے پیار سے کہا تھا اور وہ اپنے آنسو روکتی ہوئی دہلیز عبور کر گئی تھی۔ وہ اپنے ان سب رشتوں کو کیسے بتاتی کہ وہ آج اپنی زندگی کسی شخص کے نام کرنے جا رہی ہے۔

”آج اس کی نام نہاد شادی ہو رہی ہے، اس کا نکاح ہے آج، اس کی رخصتی ہو رہی ہے۔“ وہ اپنے آنسو ضبط کرتی اپنے آپ کو تسلی دیتی بس سناپ تک آگئی تھی، جہاں رابعہ شیرازی کی گاڑی منتظر کھڑی تھی، اس کے بیٹھے ہی رابعہ شیرازی نے ڈرائیور کو اشارہ کیا تھا۔ گاڑی ایک فلیٹ کے سامنے رکی تھی۔ اس فلیٹ پہ ہی ان کا نکاح ہونا تھا۔ سارا انتظام ہو چکا تھا۔ صرف عارفین کی آمد باقی تھی۔



”اروئی حیات؟“ نکاح کے دوران عارفین کی سماعتوں سے ٹکرانے والا نام اسے اپنی جگہ پہ ساکت و صامت کر گیا تھا۔

”بولے بیٹا قبول ہے؟“ مولوی صاحب اقرار مانگ رہے تھے۔

”اروئی حیات؟“ اس کے ذہن میں پھر سے بازگشت ہوئی تھی، اس نے سر اٹھا کے رابعہ شیرازی کی سمت دیکھا تھا۔

”عارفین بولونا بیٹا تمہیں اروئی حیات قبول ہے۔“ انہوں نے نرمی سے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے انتہائی نارمل سے انداز میں کہا تھا، لیکن عارفین کا دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا۔ وہ کبھی اس نام پہ غور کر رہا تھا اور کبھی رابعہ شیرازی کے نارمل سے انداز پہ اور کبھی قریب بیٹھے مولوی صاحب اور چند گواہوں پہ۔

”عارفین کہاں گم ہو گئے ہو؟ ہمیں دیر ہو رہی ہے، آدھے گھنٹے بعد فلائٹ ہے تمہاری۔“ رابعہ شیرازی کا سخت لہجہ عارفین کو سوچ کی دنیا سے یک دم واپس کھینچ لایا تھا اور پھر اس نے ماؤف ہوئے ذہن کے ساتھ۔

”قبول ہے۔“ کی نوید بخشی تھی۔ رابعہ شیرازی کا چہرہ خوشی اور فتح کے احساس سے چمک اٹھا تھا۔ نکاح نامے پہ سائن کرنے کے فوراً بعد وہ وہاں سے اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا تھا۔ جہاں اس وقت اروئی اکیلی بیٹھی اپنی ذات کے بک جانے کا ماتم منا رہی تھی، اپنی ذات کی کم مائیگی اسے بے تحاشا رلا رہی تھی۔ اس کا پورا سراپا دم بچکیوں کی زد میں تھا۔ وہ دروازے کی آہٹ پہ بھی نہیں چوکی تھی۔ مگر عارفین قدم قدم پہ چونک رہا تھا۔ ٹھنک رہا تھا۔ لہجہ رہا تھا۔ ایک طرف رابعہ شیرازی تھیں جو خوشی سے کھلی پڑ رہی تھیں اور دوسری طرف اروئی حیات تھی جو مسلسل روئے جاری تھی اور ایک وہ تھا جو اس بساط کا ایک انتہائی اہم ممبر ہوتے ہوئے بھی لاعلم تھا۔ اسے بس اتنا معلوم تھا کہ رابعہ شیرازی اس کا کسی لڑکی کے ساتھ خفیہ نکاح کروا رہی ہیں، اب وہ لڑکی کون ہے، اسے اس چیز سے قطعی کوئی سروکار نہیں تھا۔ مگر وہ لڑکی اروئی حیات ہوگی، اسے یقین نہیں آیا تھا، وہ ایک شک کی سی کیفیت میں تھا۔

”اروئی۔“ اس نے کافی بلند آواز سے اسے مخاطب کیا تھا۔ اروئی نے اپنے گھٹنوں سے سر اٹھاتے ہوئے اپنے آنسو پونچھنے کی ناکام کوشش کی تھی۔ کیونکہ وہ پھر بہتے چلے آ رہے تھے۔



”کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ یہ سب کیا ہے؟ تم یہاں کیا کر رہی ہو؟ یہ سب کیوں ہو رہا ہے؟“ وہ سوال کرتا چلا گیا تھا اور اوئی کے دل پہ گھونسا پڑا تھا، اس کی لاعلمی پہ اسے مزید دکھ ہوا تھا۔

”میں کچھ پوچھ رہا ہوں تم سے۔“ وہ غصے اور ناگواری سے مغلوب ہو کر اسے ”آپ“ کی بجائے ”آج“ ”تم“ کہہ رہا تھا۔

”یہ سب آپ سے چھپا ہوا نہیں ہے سر، آپ خود دیکھ سکتے ہیں کہ کیا ہوا ہے؟ یہاں وہی کچھ ہوا ہے جو آج تک فلموں، ڈراموں اور کہانیوں میں ہوتا آ رہا ہے۔ غربت کے ہاتھوں بے بس انسان کھڑے کھڑے کسی امیر کے در پہ بک جاتا ہے۔ غریبی بک جاتی ہے اور امیری خرید لیتی ہے اور یہ سودا آپ لوگوں جیسے معزز انسان ہی کرتے ہیں، کبھی آپ جیسے اور کبھی میڈم رابعہ شیرازی جیسے۔ یہاں بھی ایسا ہی ہوا ہے، آپ نے نہ سہی آپ کی والدہ نے سہی، مگر سودا اچھا کیا ہے۔ میری مصیبت، میری مشکل حقیقتاً اتنی ہی بڑی تھی کہ مجھے اپنا آپ بیچنا ہی پڑتا۔ آپ کی والدہ نہ ملتیں تو کوئی اور خریدار مل جاتا۔“ وہ تلخی سے کہتی..... بے دردی سے اپنے آنسو پونچھ کر بیڈ سے کھڑی ہو گئی تھی، لیکن عارفین کے آس پاس دھماکے ہو رہے تھے، اس کے ذہن کی الجھی ہوئی ساری گتھی سلجھنے لگی تھی۔

اروئی کا عارفین سے رابطہ کرنے کے چکر میں اس کے گھر جانا اور پھر وہاں رابعہ شیرازی کے جال میں پھنسا، پھر بہروز حیات کا اس کی والدہ اور وائف کی تعریف کرنا، یقیناً وہ دونوں بہروز حیات کی نظروں میں اچھا بننے کے لئے اس کی عیادت کرنے بھی گئی ہوں گی۔ پھر اروئی کا اکھڑا اکھڑا مزاج اور سونیا کو دیئے ہوئے روپے واپس کرنا، رفتہ رفتہ سب کچھ اک ترتیب سے ذہن میں سماتا چلا گیا تھا۔ مگر اب دیر ہو چکی تھی، نہ وہ کچھ کر سکتا تھا اور نہ ہی اروئی آزاد ہو سکتی تھی، ان کی ڈور اب رابعہ شیرازی کے ہاتھ میں تھی اور رابعہ شیرازی اس وقت عارفین، اروئی اور زونلہ کو مری جانے کے لئے رخصت کرنے کو تیار کھڑی تھیں، ڈرائیور سامان گاڑی میں رکھ چکا تھا، بس ان کے چلنے کی دیر تھی۔



سفر کے دوران جہاز میں بھی وہ تینوں اپنی اپنی سوچ میں گم بے حد خاموش ہی رہے تھے، کسی نے ایک دوسرے سے کچھ کہنا تو دور کی بات، بلکہ دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا، اپنی اپنی ذات کے دائرے میں ہی قید تھے سبھی، کوئی دکھی تھا، کوئی پشیمان تھا، اور کوئی مطمئن بیٹھا تھا، جس طرح اروئی کا دکھ اس کے چہرے سے نظر آ رہا تھا، اسی طرح عارفین کی پشیمانی بھی چہرے پہ واضح دکھائی دے رہی تھی، مگر ان دونوں سے ہٹ کر زونلہ خاصی مطمئن تھی۔ اسے ان لوگوں کے ساتھ محض کچھ عرصہ ہی مری میں رہنا تھا اور جیسے ہی اروئی کی طرف سے بچے کی نوید ملتی زونلہ کا ارادہ انگلیڈ چلے جانے کا تھا، کیونکہ انہوں نے بابا جان کو یہ ہی بتایا تھا کہ زونلہ انگلیڈ جا رہی ہے اور وہاں جا کر علاج کروانا چاہتی ہے، جس پہ بابا جان بہت خوش ہوئے تھے اور پلان کے مطابق زونلہ نے انگلیڈ سے تب ہی واپس آنا تھا جب اروئی کے ہاں بچہ ہو جاتا، کیونکہ اگر زونلہ بھی مری میں رہتی تو ہو سکتا تھا کہ جھوٹی پریکٹسی کی خوشخبری سن کر بابا جان بھی زونلہ سے ملنے کے شوق میں مری چلے آتے۔ لہذا پہلے سے ہی یہ کہہ دیا گیا تھا کہ زونلہ انگلیڈ جانے والی ہے۔

”سرگھر آچکا ہے۔“ ایک بہت ہی خوبصورت کانٹنچ کے سامنے گاڑی روک کر ڈرائیور نے اسے متوجہ کیا تھا، کیونکہ عارفین حال میں موجود نہیں تھا، کہیں اور پہنچا ہوا تھا۔

”عارفین کہاں گم ہیں؟“ زونکہ نے گاڑی سے اترتے ہوئے خاصے زور سے اس کا کندھا ہلایا تھا اور وہ بری طرح چوتکتے ہوئے حواسوں میں واپس لوٹا تھا۔ اس نے فوراً پلٹ کر پیچھے دیکھا۔ ارونی بھی اپنی سیٹ پہ جمی بیٹھی تھی۔ اس کے حواس بھی موجود نہیں تھے۔

”میڈم آپ بھی آجائیے۔“ زونکہ نے گاڑی کے اندر جھانک کر غصے سے کہا تھا اور وہ اپنے دھیان سے گڑبڑاتے ہوئے فوراً گاڑی سے اتر آئی تھی۔ عارفین ان دونوں سے پہلے ہی اندر جا چکا تھا۔

”ڈرائیور سامان اندر پہنچا دو۔“ زونکہ نے جاتے جاتے حکم جاری کیا تھا۔

”جی میڈم۔“ ڈرائیور فوراً سامان نکالنے میں لگ گیا تھا۔ عارفین نے اپنا یہ ذاتی کائج پچھلے سال ہی ڈیزائن کیا تھا، لیکن مصروفیت کی وجہ سے اتنا ٹائم ہی نہیں ملا تھا کہ وہ یہاں آ کر چند دن رہ لیتا۔ بس پچھلے دنوں گھر سے بغیر بتائے ہوئے نکلا تو یہاں آ گیا تھا اور وہ دو ہفتے اس نے بہت ریلیکس گزارے تھے، لیکن تب اسے یہ اندازہ ہرگز نہیں تھا کہ چند دن بعد وہ اپنی دو عدد بیویوں کے ہمراہ یہاں رہنے کے لئے آجائے گا۔

وہ تو باتوں باتوں میں جب اس نے رابع شیرازی کو بتایا کہ وہ ایک پروجیکٹ کے سلسلے میں مری کچھ عرصہ رہنے کے ارادے سے جا رہا ہے تو انہوں نے فوراً اپنے شاطرانہ دماغ کو استعمال میں لاتے ہوئے پورا پلان ترتیب دے ڈالا تھا، اور اس پلان میں کیا کچھ ہو گیا تھا، یہ ہی سوچ کر عارفین کو وحشت ہونے لگی تھی۔

”سر یہاں سامان رکھ دو؟“ عارفین اپنے بیڈروم کے صوفے پہ آڑا ترچھا لیٹا تھا، جب اپنے سامان کے ساتھ ایک اور بیگ دیکھ کر چونک گیا تھا، کیونکہ وہ بیگ یقیناً زونکہ کا نہیں تھا۔ زونکہ جب گھر سے نکلی تھی اس کے ساتھ سلور کلر کا اٹیچی بیگ تھا، جو وہ اپنے ہمراہ گھسیٹتی ہوئی آئی تھی۔ تو گویا یہ بیگ ارونی کا تھا؟ عارفین کے اعصاب مزید شل ہو گئے تھے۔

”یہ بیگ میرا نہیں ہے، یہ ساتھ والے کمرے میں رکھ دو۔“ اس نے ڈرائیور کو وہ بیگ رکھنے سے منع کر دیا تھا۔

”نہیں یہ بیگ یہیں رہے گا اور اس بیگ کے ساتھ ساتھ اس بیگ کی مالک بھی یہیں رہے گی، یہ میرا نہیں بلکہ مام کا آرڈر ہے۔“ ڈرائیور کے عقب سے زونکہ نمودار ہوئی تھی اور زونکہ کے پیچھے وہ بے بس کھڑی تھی۔

”زونکہ پلیز بس کرو، میرا دماغ پھٹ جائے گا، میں پاگل ہو جاؤں گا۔“ وہ کپٹی پہ ہاتھ رکھتے ہوئے چیخ پڑا تھا اور زونکہ ہلکے سے مسکرائی تھی۔

”آپ خواخواہ پاگل ہو رہے ہیں؟ مجھے دیکھنے میں تو اپنی سوتن کو انسی خوشی قبول کر رہی ہوں اور آپ کے پاس چھوڑ کر جا رہی ہوں، میرے ظرف کی داد دیجئے۔“ زونکہ نے اپنے آپ کو خود سراہا تھا۔

”یہ تمہارا ظرف نہیں، تمہاری کیننگی ہے، تمہارا مطلب ہے، تمہاری غرض ہے اس میں۔ آج اگر اس لڑکی سے میں اپنی مرضی سے شادی کر کے لایا ہوتا تو پھر میں دیکھتا کہ تمہارے ظرف کی حد کتنی ہے؟ تم مجھے داد دو کہ میں یہ سب کچھ برداشت کرتا چلا آ رہا ہوں۔“ وہ بے حد تنگی سے بات کر رہا تھا۔

”جب برداشت ہی کرنا ہے تو پھر اتنا غصہ کیوں کر رہے ہیں؟ آپ کی نئی نئی شادی ہوئی ہے، انجوائے کریں۔“ وہ انتہائی بے نیازی سے کہتی پلٹ کر دروازے تک چلی گئی تھی، لیکن باہر نکلتے نکلتے اس نے ایک بار پھر پلٹ کر دیکھا اور وہی بے بس دلا چارسی کشکش میں کھڑی تھی۔



”اور میڈم آپ بھی ذرا ذہن نشین کر لیں کہ یہ آپ دونوں کا مشترکہ بیڈ روم ہے، آپ لوگوں نے ایک ساتھ رہنا ہے، کوئی خرہ، کوئی ڈھکوسلہ نہیں چلے گا یہاں۔“ وہ جیسے انداز سے کہہ کر دروازہ بند کر کے چلی گئی تھی اور وہ دونوں قربانی کے جانور کی طرح اپنی اپنی جگہ پہ بندھے رہ گئے تھے۔



ان دونوں کی ساری رات آنکھوں میں گزری تھی، عارفین اتنی شدید سردی کے باوجود ٹیئرس پہ کھڑا رہا تھا اور روٹی اتنی تھکن اور ذہنی ٹینشن کے باوجود ایک نیک بیڈ سے ٹیک لگائے ہوئے بیٹھی رہی تھی، نہ اس نے پلک جھپکی تھی اور نہ وہ سو پایا تھا اذیت کا دریا دونوں طرف برابر بہہ رہا تھا اور اس دریا میں وہ دونوں ایک ساتھ ڈوبے ہوئے تھے، سانس دونوں کی بند ہو رہی تھی، مگر زندہ رہنے اور زندگی جینا دونوں کی مجبوری تھی۔ لہذا صبح ہونے تک وہ دونوں اپنے اپنے دل کو اور اپنے اپنے دماغ کو سمجھانے اور تسلی دلا سہ دینے میں لگ گئے تھے۔ جب اتنا بڑا قدم اٹھایا تھا تو پھر اب آگے بھی بڑھنا تھا، کیونکہ پیچھے مڑنے کا اب نہ تو کوئی راستہ تھا اور نہ ہی کوئی وقت۔

سو بہتر یہ ہی تھا کہ وقت کے سانچے میں ڈھل کر سب کچھ درگزر کر دیا جاتا۔ کیونکہ ہونا تو وہی تھا جو ہو چکا تھا، اور جو ہو چکا تھا وہ بدل نہیں سکتا تھا اور جن میں کچھ بدلنے کی سکت اور جرأت ہی نہیں تھی وہ سوچ سوچ کر پاگل کیوں ہو رہے تھے بھلا؟ اور یہ ہی سوچ کر روٹی نے اپنے اعصاب کنٹرول کر لئے تھے اور دل پہ بھاری پتھر رکھتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی تھی، فجر کی اذان ہو چکی تھی، نماز کا وقت نکلا جا رہا تھا، اسے سب کچھ بروقت سنبھالنا تھا۔ نماز کے بعد اس نے اپنے رب سے گز گڑا کر اپنے لئے حوصلہ، صبر اور سکون مانگا تھا اور بہتری کی دعا کی تھی۔



صبح ناشتے کے لئے زونلہ نے ملازمہ کو بلانے بھیجا تھا اور روٹی چپ چاپ خاموشی سے اٹھ کر ملازمہ کے ساتھ ہی نیچے آ گئی تھی، لیکن روٹی کو یہ نہیں پتہ تھا کہ اسے اب لمحہ لمحہ امتحان سے گزرنا ہوگا۔ جیسے ہی وہ نیچے آئی زونلہ نے سر تاپا اسے کھوجتی ہوئی نظروں سے دیکھا تھا اور ان ”نظروں“ میں کیسی ”کھوج“ تھی یہ دیکھ کر روٹی کٹ کے رہ گئی تھی۔

”آف اس بارے میں تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔“ اسے زونلہ کی نظروں نے بہت کچھ باور کروا دیا تھا۔

”لگتا ہے اپنی مظلومیت کا خوب دل کھول کر روگ مٹایا ہے خوب دھوم دھام سے ماتم کیا ہے ساری رات؟“ زونلہ کچھ کہنے سے باز نہیں آئی تھی۔ جبکہ روٹی کی گردن اور نظریں جھکی ہوئی تھیں، وہ کچھ بھی کہنے کے قابل نہیں تھی، آخر وہ کہتی بھی کیا؟

”میڈم اروٹی حیات آپ کو یہاں بیاہ کر لائے ہیں تو کسی مقصد کے لئے..... محض انجوائے کرنے نہیں آئے۔ آپ ایک بار پھر کان کھول کر سن لیں عارفین آپ کا شوہر اور آپ اس کی بیوی ہوتی ہیں آج کل..... اور میاں، بیوی دور، دور نہیں رہتے سمجھیں آپ؟“ زونلہ کی باتیں سن کر اروٹی کا جی چا پا کہیں ڈوب کے مر جائے یا پھر زمین پھٹے اور اس میں سما جائے، کیونکہ سامنے ہی اس کا منج کے ڈرائنگ روم میں بنی لکڑی کی سیڑھیوں پہ عارفین کھڑا تھا اور زونلہ کی گفتگو کے معنی با آسانی سن بھی رہا تھا اور سمجھ بھی رہا تھا۔

”وہ لاکھوں کی رقم تمہارے جسم کے لئے دی ہے، تمہارے جسم کو سات پردوں میں سنبھال سنبھال کے رکھنے کے لئے نہیں دی، اتنی نیک

پروین بی بی بننے کی کوشش مت کرو اور عارفین کے قریب رہنے کی کوشش کرو۔ ورنہ مام کو پتہ چل گیا تو وہ پہلی فلائٹ سے یہاں پہنچ جائیں گی۔“  
زومکہ نے اچھی خاصی بک بک کرنے کے بعد اسے ناشتے کی اجازت دی تھی۔ لیکن عارفین وہیں سے واپس لوٹ گیا تھا۔



”اروئی کیوں کیا تم نے ایسا؟ کیوں تم نے اپنے ساتھ مجھے سولی پہ لٹکا دیا ہے۔ میرا جی چاہتا ہے میں اپنے آپ کو گولی مار دوں۔ میں سوچ سوچ کر تھک گیا ہوں، پاگل ہو گیا ہوں میں، مجھے سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ سب کیا ہوا ہے؟ اور..... اور آئندہ کیا ہوگا؟ آخر کیا بنے گا تمہارا؟ تم نے اتنا بڑا قدم کچھ بھی سوچے بغیر کیسے اٹھالیا؟“ وہ اروئی کے سامنے پشیمان اور بے بس کھڑا تھا، اور اس کے سوالوں پہ اروئی تلخی سے مسکرائی تھی۔

”سریہ سب جو کچھ بھی ہوا ہے یہ ازل سے میری قسمت میں لکھا تھا اور اب اس لکھے کا دوش کس کو دوں؟ بس دکھ اس بات کا ہے کہ مجھے آپ کے لئے خریدا گیا ہے، خریداروں کی صف میں آپ کی ماں کھڑی ہیں، جبکہ میرے دل میں، میرے دماغ میں آپ کے لئے اور آپ کے گھر والوں کے لئے ایک بہت اونچا ”سنگھاسن“ بنا ہوا تھا جو چند دن پہلے اتنے زور سے گرا کہ اس پہ بٹھائے گئے سارے معتبر مجسمے ٹوٹ گئے اور ان ٹوٹے مجسموں کی کرچیاں اتنی تیز اور نوکیلے ہیں کہ جب جب چھتی ہیں تو تکلیف ہوتی ہے اور تکلیف پہ آنسو نکل آتے ہیں۔“ وہ کہتے کہتے اپنے رخساروں پہ ڈھلک آنے والے آنسوؤں کو رگڑنے لگی تھی۔

”کیا اس سنگھاسن پہ میں بھی تھا اروئی؟“ عارفین جیسے کسی خدشے کے تحت پوچھ رہا تھا۔

”آپ تو اس سنگھاسن کا سنگھار تھے سر۔“ اروئی کی آواز بھرا گئی تھی۔

”تھے؟“ عارفین نے پھر پوچھا تھا۔

”ہاں آپ بھی تھے، مگر اب کہیں نہیں ہیں، اب آپ امیر کبیر خریداروں میں نظر آتے ہیں، اب تو یہی دھڑکا لگا رہتا ہے کہ نہ جانے کب مجھ پہ کوئی اور مصیبت آجائے اور کب مجھے پھر بکنا پڑ جائے۔“ اروئی کا لفظ لفظ نوکدار تھا۔

”کیا میں تمہیں ایسا نظر آتا ہوں اروئی؟“ عارفین کو اس کی باتوں سے بہت تکلیف ہو رہی تھی۔

”آپ جیسے نظر آتے تھے اب ویسے نظر نہیں آتے۔ اب بہت کچھ بدل چکا ہے سر۔ آپ، آپ نہیں رہے اور میں، میں نہیں رہی۔ پہلے ہم میں ایک خلوص، ایک محسن اور مہربان کا رشتہ تھا۔ اب ہمارے درمیان ایک سودا ہے، کسی دکان دار اور گاہک کا سارشتہ ہے۔“

”لیکن اروئی میں اس سارے قصے میں کہاں قصور وار ہوں، مجھے بس اتنا بتا دو کہ میرا جرم کیا ہے؟“ عارفین تو بچ بچے گناہ مارا جا رہا تھا۔  
”اچھے انسان کو برا بننے میں دیر نہیں لگتی، بس ایک سنگھاسن سے گرنے کی دیر ہوتی ہے۔ آپ کے گھر والے اچھائی کا چولا اتار سکتے ہیں تو آپ بھی اتار سکتے ہیں، اس لئے بہتر یہ ہی ہے کہ میں کسی سے بھی کوئی اچھی امید نہ رکھوں، میں آپ کے لئے خریدی گئی ایک ”جیز“ ہوں۔ اب آپ اس جیز کو جب چاہے ”استعمال“ کر سکتے ہیں، اور جب چاہے چھوڑ سکتے ہیں، آپ کو کسی طرف سے کوئی روک ٹوک نہیں ہوگی، جس طرح اس کمرے کی تمام چیزوں پہ آپ کا حق ہے، آپ کا اختیار ہے، بالکل اسی طرح مجھ پہ بھی ہے، آپ جب چاہیں اپنا حق استعمال کر سکتے ہیں، میں انکار نہیں



کروں گی، چاہے خود اپنی ذات پہ جبر کا پہاڑ کھڑا کرنا پڑے۔ میں وہ بھی کر لوں گی، لیکن آپ کو شکایت نہیں ہونے دوں گی۔“ ارووی نے آج صاف صاف بات کرتے ہوئے اپنی شرم و حیا بھی بالائے طاری رکھ دی تھی، کیونکہ وہ یہی سوچ رہی تھی کہ جب اس ندی میں پاؤں ڈال ہی دیا تھا تو اب پار بھی لگنا تھا، ڈرڈر کے قدم اٹھانے سے کیا حاصل؟ لیکن دوسری طرف عارفین مطمئن نہیں ہو پار ہاتھا، اسے ارووی کے ساتھ ہونے والی زیادتی کا ملال تھا۔ کوئی اور لڑکی ہوتی تو شاید وہ بھی اس مسئلے کو فراموش کر ڈالتا، مگر نہ جانے کیوں ارووی سے اس کے کیسے احساسات وابستہ تھے کہ وہ اس زیادتی، اس سودے کو فراموش نہیں کر پار ہاتھا۔ شاید وہ ارووی کو اس روپ میں قبول نہیں کر پار ہاتھا۔



ان لوگوں کو مری آئے ہوئے پورا ایک ماہ ہو چکا تھا اور یہ پورا ایک ماہ عارفین اپنے آپ کو سمجھانے میں لگا رہا تھا، ہاں اس ایک ماہ میں بس یہ تبدیلی آئی تھی کہ دونوں میں بات چیت کا سلسلہ بحال ہو گیا تھا۔ ارووی اگر اچھے طریقے سے پیش آتی تھی تو عارفین بھی نارمل ہونے لگا تھا اور اس چیز کا اندازہ ان کی گفتگو سے ہوتا تھا، اس وقت بھی عارفین کو آتے دیکھ کر ارووی تیزی سے قریب آتی تھی۔ عارفین کا کام آج کل زوروں پہ تھا اس کی مری والی برانچ میں بھی کافی پروجیکٹ کا اضافہ ہو چکا تھا اور وہ ہر کام اپنی موجودگی میں کروا رہا تھا۔ ابھی بھی وہ آفس سے ہی لوٹا تھا۔

”چائے لے کر آؤں آپ کے لئے؟“ وہ کچھ دیر ریلیکس کرنے کے لئے صوفے پہ بیٹھا تھا، جب وہ بھی بیویوں کے روپ میں سامنے آنے لگی ہوئی تھی۔ حالانکہ وہ ان چیزوں کا عادی نہیں تھا، نہ ہی اس کی سوسائٹی میں بیویاں اتنی تابعداری کا مظاہرہ کرتی تھیں۔ مگر پھر بھی نہ جانے کیوں اسے ارووی کا یہ انداز بہت اچھا لگتا تھا، اس کا کیر کرنا دل کو عجیب سی خوشی بخشتا تھا۔ مگر وہ اس خوشی کا اظہار نہیں کر سکتا تھا، اور نہ ہی اس خوشی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محسوس کر سکتا تھا۔ کیونکہ اسے پتہ تھا کہ سب کچھ عارضی ہے۔ اسے اپنا اور ارووی کا رشتہ کاغذی پھول جیسا لگتا تھا۔ جس کا رنگ بناؤٹی تھا اور خوشبو تھی ہی نہیں۔ بغیر خوشبو کے پھول سارشتہ تھا جو کسی بھی وقت مرجھا سکتا تھا اور اس کے مرجھانے کا خدشہ ہی دل و دماغ کو مٹھی میں بھینچ کر رکھ دیتا تھا۔

”کیا بات ہے آج آپ چائے نہیں لیں گے کیا؟“ اس نے پھر اسے مخاطب کیا تھا۔

”ہوں کیا کہا؟“ وہ چونک کر متوجہ ہوا تھا۔

”آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“ وہ اب کی بار ذرا فکر مندی سے پوچھ رہی تھی۔

”ہاں ٹھیک ہوں۔“ وہ مختصر سا کہہ کر وہاں سے اٹھ کر بیڈروم میں آ گیا تھا، اور اس کے پیچھے تقریباً دس منٹ بعد وہ چائے لے کر بیڈروم میں آ گئی تھی۔ وہ ابھی ابھی شاور لے کر کپڑے چھینچ کر کے واش روم سے بال تولیے سے رگڑتے ہوئے برآمد ہوا تھا۔

”اس تکلف کی کیا ضرورت ہے؟“ میں ان چیزوں کا عادی نہیں ہوں میری کیر آج تک میری ماں نے نہیں کی تم تو پھر چند دن کی مہمان ہو۔“ اس کا انداز تلخی لئے ہوئے تھا۔

”جب تک میں آپ کے ساتھ ہوں، میں آپ کی بیوی ہوں، اور ایک بیوی ہونے کے ناطے مجھ پہ فرض ہے کہ میں آپ کا خیال رکھوں، آپ کے کام خود کروں، اب اس سے آپ کی عادت بگڑتی ہے یا سنورتی ہے، مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ اس نے چائے کا کپ اٹھا کر بہت

ہی نارٹل سے انداز میں اس کی سمت بڑھایا تھا اور عارفین مزید انکار اور ان گنوں نہیں کر سکتا تھا، اس کے ہاتھ سے چائے کا کپ لیتے ہی بنی تھی۔

”کھانا کب کھائیں گے؟“ وہ اسے چائے دے کر واپس پلٹ رہی تھی، جب ذرا ٹھہر کر پوچھا تھا۔

”فی الحال بھوک نہیں ہے لیٹ نائٹ کھالوں گا۔“ وہ چائے کا سپ لیتے ہوئے مڑ کر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے چلا گیا تھا، اور اروئی باہر نکل گئی تھی۔



”میری وائٹ شرٹ کہاں ہے؟“ عارفین اپنی شرٹ ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گیا تو جھنجھلا کے پوچھا تھا اور اروئی جو اپنی فراغت کی وجہ سے کوئی کتاب پڑھنے بیٹھی تھی چونک کر سیدھی ہو گئی۔

”آپ کی وائٹ شرٹ پہ داغ لگا ہوا تھا، میں نے اسے دھو کر دھوپ میں پھیلا دیا ہے۔“ وہ کتاب بیڈ پہ اوندھی رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

”کوئی دھوپ میں؟“ عارفین نے مزید جھنجھلا کر پوچھا۔ باہر اتنی دھوپ نکلی ہوئی تھی اس لئے میں نے.....“ کہتے کہتے اروئی کی نظر کھڑکی کی سمت اٹھی اور وہ حیران رہ گئی، ہلکی بارش کے ساتھ ہلکی ہلکی برف کی پھوار بھی جاری تھی۔

”لیکن تھوڑی دیر پہلے تو اتنی اچھی دھوپ تھی کہ سبھی لوگ سڑکوں پہ نکل آئے تھے۔“ اروئی کو ذرا سی دیر میں موسم کی ایسی تبدیلی پہ حیرت ہو رہی تھی۔

”محترمہ یہ مری ہے ہمارا کراچی نہیں۔ جہاں خوش گوار موسم کبھی قسمت سے ہی میسر آتے ہیں۔“ اس نے سر جھٹکتے ہوئے طنز کیا تھا اور اپنی دوسری شرٹ ڈھونڈنے لگا جو اس کی پینٹ سے کچھ میچ کر جاتی..... اتنے میں اروئی دروازہ کھول کر باہر نکل گئی تھی۔ لان کے ایک کونے میں شاید دو روز پہلے ہی اس نے ری باندھی تھی کہ کبھی کبھار کوئی کپڑا اسی سکھانے کے لئے ڈال دیا جاتا ہے اور آج اس نے اس ری سے کام لے لیا تھا۔ مگر موسم کام خراب کر گیا تھا۔

”ایم سوری سر شرٹ تو خراب ہو گئی ہے۔“ وہ جب واپس آئی تو تھر تھر کانپ رہی تھی، برف کی ٹھنڈک سے اس کی رنگت نیلی پیلی ہو گئی تھی۔ بارش کے قطرے اس کے دوپٹے کو بھی بھگو گئے تھے اور برف کی پھوار ابھی بھی اس کے سر پہ سفید روئی کی طرح جمی نظر آ رہی تھی۔ عارفین نے بے حد سرسری نظر سے اس کو سرتا پادیکھا تھا۔ مگر سرسری نظر کب ”گہری نظر“ میں بدل گئی اسے کچھ پتہ نہیں چلا تھا۔

”محترمہ صرف شرٹ ہی خراب نہیں ہوئی آپ کا حلیہ بھی خراب ہو چکا ہے۔“ عارفین نے اس کے بھیکے ہوئے کپڑوں کی سمت اشارہ کیا تھا۔

”اوہ نو۔“ اسے اپنی سنگین غلطی کا اب احساس ہوا تھا۔

”کیوں کیا؟“

”میرے یہ کپڑے بھی بھیک گئے اور وہ کپڑے بھی۔“

”وہ کپڑے؟“ عارفین نے سوالیہ دیکھا۔



”ہاں میں نے اپنے کپڑے بھی دھو کر پھیلائے تھے۔“ اس نے غلطی کا اعتراف کیا۔

”تو کیا اور کپڑے نہیں ہیں آپ کے پاس؟“ وہ چونک اٹھا، اس نے اروئی کے کپڑوں پہ غور کیا، تو وہی تین، چار مخصوص سے سوٹ یاد آئے جو وہ گھر سے ساتھ لے کر آئی تھی، جبکہ عارفین اور زونکہ تو اپنے لئے اتنے عرصے میں کئی بار شاپنگ کر چکے تھے، بلکہ یہاں آکر زونکہ کا تو کام ہی یہی تھا یا گھومنا پھرنا یا ہر روز شاپنگ کرنا، اس وقت بھی وہ کہیں باہر نکلی ہوئی تھی۔ اس کی چپ سے وہ شرمسار سا ہو گیا تھا اور کوئی بھی سوال کئے بغیر رخ پھیر لیا تھا۔ ایک بار پھر اس سے کوتاہی ہو گئی تھی۔

جب اروئی اتنے نازک اور سنگین حالات کے باوجود اس کی ذرا ذرا سی بات کا خیال اور دھیان رکھ سکتی تھی تو پھر وہ ایسا کیوں نہیں کرتا تھا؟ اتنا لا پرواہ کیوں ہو جاتا تھا، آخر؟ لیکن اب اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ بھی اس کا بھرپور خیال رکھے گا۔ اسے اروئی کے رنگ اڑے کپڑے دیکھ کر بے حد ندامت ہو رہی تھی کہ اسے پہلے خیال کیوں نہیں آیا؟ وہ خود کپڑے چینج کرنے چلا گیا تھا۔ جب تک اروئی نے جیسے تیے اپنا ایک سوٹ استری سے خشک کر ہی لیا تھا اور اپنے بھیکے ہوئے کپڑے چینج کر کے دوسرے پہن لئے تھے۔

”تم کھانا بنا چکی ہو؟“ عارفین پر فیوم اسپرے کرتے ہوئے بولا۔

”نہیں ابھی بنانے لگی ہوں۔“ اروئی کچن میں جانے کی تیاریوں میں تھی۔

”نہیں آج رہنے دو، آج ہم باہر سے کھانا کھائیں گے۔“ وہ اپنا والٹ اٹھا کر جیب میں رکھتے ہوئے بولا تھا۔

”لیکن باہر سے کیوں؟“ اروئی حیرانی سے بولی تھی۔

”بس آج اتنے اچھے موسم کو دیکھ کر موڈ ہو رہا ہے اور ویسے بھی کبھی کبھی ہوٹلنگ بھی کر لینی چاہیے طبیعت پہ اچھا اثر پڑتا ہے۔“ وہ اپنا موبائل اور گھڑی بھی اٹھا چکا تھا۔

”لیکن میں کیسے جاسکتی ہوں؟“ اروئی کو اپنی حالت دیکھ کر احساس ہوا تھا، بے حد عام سے کپڑے، نہ کوئی گرم چادر تھی اور نہ ہی گرم پلیپر تھے۔

”یہ میری چادر لے لو۔“ عارفین نے اپنی گرم وول کی چادر اٹھا کر اسے تھمائی کہ وہ کندھوں پہ ڈال لے۔

”مگر سر اس طرح اچھا۔“

”کچھ نہیں ہوگا یا تم چلو تو سہی۔“ عارفین نے بے ساختگی سے کہتے ہوئے اس کو ہاتھ سے پکڑ کر کھینچا تھا اور پھر اگلے ہی لمحے اپنی بے تکلفی اور بے ساختگی کا احساس بھی ہو گیا تھا۔

”سوری۔“ اس نے ذرا فخل ہوتے ہوئے اروئی کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا اور اروئی نظریں چراگئی تھی۔

وہ دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے پور نیکو میں پہنچے ہی تھے کہ اتنے میں زونکہ اپنی گاڑی سے اترتی دکھائی دی تھی۔

”اوہو جناب آج کہاں کی تیاریاں ہیں؟“ زونکہ نے انہیں ایک ساتھ دیکھ کر معنی خیز خوشگواریت کا اظہار کیا تھا۔ اروئی کا چہرہ جھک گیا تھا۔

”بس آج مال روڈ پہ گھومنے کا موڈ ہو رہا ہے۔“ عارفین گاڑی کا ڈور کھولتے ہوئے لا پرواہی سے بولا تھا۔

”اولیٰ شاپنگ کرنے کا ارادہ ہے؟“

”ہوں..... بالکل شاپنگ کا ارادہ ہے۔“ اس نے اثبات میں سر ہلایا تھا اور اروی کو گاڑی میں بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا۔

”اچھا ارادہ ہے اوکے انجوائے یور سیلف۔“ زونکہ مسکراتی ہوئی اندر چلی گئی تھی اور عارفین ایک پل کے لئے یہ سوچنے پہ مجبور ہو گیا تھا کہ کیا بیویاں زونکہ جیسی بھی ہوتی ہیں جو اپنے شوہر کو دوسری عورت کے ہاتھوں سوئپ کر اس کے ساتھ دیکھ کر خوش ہوتی ہیں؟ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ مزید سوچتا، مگر اروی کا خیال کرتے ہوئے اس نے سر جھٹک دیا تھا اور گاڑی باہر نکال لی تھی۔ عارفین اس کی چپ اور اداسی دور کرنے کی غرض سے اس کے گھر والوں کا ذکر چھیڑ لیتا تھا اور وہ زرا دیر کے لئے کچھ بہل جاتی تھی، اس وقت بھی وہ باتیں کرتے کرتے شاپنگ کرنے نکل آئے تھے اور رفتہ رفتہ عارفین نے ڈھیر ساری شاپنگ کر ڈالی تھی۔

”سر پلیز بس کریں، اتنا سب کچھ لینے کی کیا ضرورت ہے؟“ اروی اسے روکنے لگی، وہ اتنی شاپنگ دیکھ کر بوکھلا گئی تھی۔

”یہ سب تمہاری ضرورت کی چیزیں ہیں، جب گھر جا کر استعمال کرو گی تو پھر تمہیں اندازہ ہوگا کہ تمہیں ان کی کتنی ضرورت تھی۔“ اس نے اس کے لئے کاسمیٹکس کی بھی کافی چیزیں لی تھیں اور کچھ چیزیں اس نے وہ بھی خریدی تھیں جن کو دور سے ہی دیکھ کر اروی شاپ میں داخل ہی نہیں ہوئی تھی، اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا اور تھیلیوں میں پسینہ پھوٹ نکلا تھا۔

”چلو اب کچھ کھا لیتے ہیں، کافی بھوک لگ رہی ہے۔“ وہ شاپنگ بیگ سنبھال کر والٹ جیب میں ڈالتے ہوئے باہر آیا تو اروی نے اسے دیکھنے سے بھی گریز کیا تھا۔ عثمانیہ ریسٹورنٹ تک وہ دونوں چھتریوں کا سہارا لے کر پیدل چلتے ہوئے آئے تھے۔ بارش کی بوندوں میں تو کمی آگئی تھی، مگر برف کی پھوارا بھی بھی ہنوز تھی۔ ان کی واپسی رات دیر گئے ہوئی تھی اور تب تک زونکہ سوچکی تھی، اسے کچھ پتہ نہیں تھا کہ وہ کیا کچھ لے کر آئے تھے؟ اور آتے سے اتنے تھکے ہوئے تھے کہ بیڈ پہ گرتے ہی نیند آگئی تھی۔ حالانکہ جسم سن ہو رہا تھا۔





وہ عارفین جس نے پہلے روز سے اروئی حیات کو کبھی بھی نہ چھوئے کا عہد کر رکھا تھا، وہ اب اپنے عہد سمیت متزلزل ہو چکا تھا اس کا دل، اس کا دماغ، اس کی سوچیں، اس کی دھڑکنیں اسے کسی نئی راہ پر ڈال رہی تھیں اور وہ بیٹھے بٹھائے اک نئی ڈگر پہ چل نکلا تھا۔ اروئی کے حوالے سے اس احساسات اور جذبات میں کافی زیادہ تبدیلی آگئی تھی، وہ اپنے رشتے کو کچے رنگ کی بجائے ایک پکارنگ دینا چاہتا تھا اور اس حوالے سے اس نے بہت کچھ سوچ لیا تھا، اسی لئے آج کل وہ کچھ فریش اور ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا اور اس کے موڈ کی خوشگواریت اروئی کے علاوہ بھی سبھی نے محسوس کی تھی۔

اس وقت وہ اپنے کمرے کے ٹیرس پہ دو کرسیاں ڈالتے بیٹھے ہوئے تھے اور برف باری کا منظر انجوائے کر رہے تھے، ساتھ ساتھ ملکی پھلکی باتیں بھی جاری تھیں۔

”اس موسم میں سب سے زیادہ ضروری چیز ہوتی ہے چائے، اور وہ ہمارے پاس ہے ہی نہیں، اس لئے آپ ویٹ کریں میں ابھی چائے لے کر آتی ہوں۔“ اروئی مسکراتے ہوئے کہہ کر ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی تھی، مگر عارفین نے ہاتھ بڑھا کر اس کا ہاتھ تھام لیا تھا، اس کے مضبوط ہاتھ کی پرحمت گرفت کا لمس ”کچھ اور ہی کہہ رہا تھا“ جس پہ اروئی کا دل سکڑ کر سمٹا تھا۔

”بیٹھ جاؤ اس موسم میں ”صرف“ چائے ہی ضروری نہیں ہوتی ایک دوسرے کا ساتھ اور قربت بھی بہت معنی رکھتی ہے۔ چائے تو بعد میں بھی مل سکتی ہے، مگر احساس کے لمحے دوبارہ ہاتھ نہیں آتے۔“ اس نے اروئی کا ہاتھ چھوڑے بغیر اسے واپس چیر پہ بٹھا دیا تھا اور اروئی کی جیسے قوت گویائی منجھدی ہو کے رہ گئی تھی۔

”اس وقت میرے ہاتھ میں چائے کا کپ نہیں بلکہ تمہارا ہاتھ و لکڑ لگ رہا ہے اور اس موسم کی ساری رنگینی، سارے لطف تمہارے اس خوبصورت ہاتھ کے لمس میں سمٹ آیا ہے۔ اب تم بتاؤ کہ میں اس ہاتھ کو چھوڑ کر ایک بے جان کپ کی کیسی خواہش کر لو؟“ عارفین اور اروئی کی کرسیاں اک دوسرے کے آمنے سامنے بچھی ہوئی تھیں، دونوں رو برو بیٹھے تھے اور اس کا ہاتھ وہ اپنے دونوں ہاتھوں میں دباتے ہوئے بغور اس کی مخر و ملی انگلیوں اور ترشے ہوئے ناخنوں کو دیکھ رہا تھا۔

”تمہارے ہاتھ بہت خوبصورت ہیں اور اروئی، اگر کبھی اس ہاتھ پہ میں اپنا دل رکھ دو تو کیسا لگے گا؟“ وہ اس کی شفاف گلابی ہتھیلی پھیلاتے ہوئے بولا، اروئی نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔

”بولو اروئی کیا میں اس ہاتھ پہ اپنا دل رکھ سکتا ہوں؟“ اب کی بار اس کے لہجے میں بے قراری سمٹ آئی تھی۔

”سر میرے اس ہاتھ کی اتنی اوقات کہاں کہ اس پہ کوئی اپنا دل رکھ دے۔ یہ ہاتھ ایک غریب مفلس لڑکی کا ہاتھ ہے، یہ ہاتھ بہت سے لوگوں سے بھیک مانگ چکا ہے، بہت حقیر ہے یہ اور آپ۔“ وہ کچھ کہتے ہوئے چپ ہو گئی تھی۔

”میں اس سے زیادہ حقیر ہوں اروئی۔ جیسے یہ خالی ہے ویسے ہی میں بھی خالی ہوں، میرے پاس بھی کچھ نہیں ہے..... اور جو ہے وہ میں اس ہاتھ میں سوئپ دینا چاہتا ہوں، اور جو چیز میں اس ہاتھ میں سوئپ رہا ہوں وہ میں نے آج تک کبھی کسی کے حوالے نہیں کی، کبھی کسی کا سایہ بھی نہیں پڑنے دیا یا پھر مجھے یہ کہنا چاہیے کہ مجھے آج تک کوئی ایسا ملا ہی نہیں جو اس کے قابل لگتا اور جب کوئی اس کے قابل لگتا تب میں شادی شدہ ہو چکا تھا،

لیکن اللہ نے کچھ ایسی سبیل نکال ہی دی کہ میں آج سب کچھ کہنے کے لئے اپنے آپ کو آزاد محسوس کر رہا ہوں۔“

”سر پلیز آپ یہ دل کے حساب کتاب رہنے دیں کوئی اور بات کریں۔“ اروی کتر اگئی تھی۔

”کیسے رہنے دوں؟ بڑی مشکل سے تو کوئی لمحہ میسر آیا ہے۔“ عارفین نے دل کی گہرائیوں سے کہتے ہوئے اروی کی ہتھیلی کو پورے استحقاق سے چوم کر اپنے دل پہ رکھ لیا تھا اور وہ جیسے لرز کے رہ گئی تھی، اتنی شدید سردی کے باوجود اس کے ماتھے پہ پسینہ آ گیا تھا۔ عارفین ان لمحوں کو کچھ اور طول دیتا، مگر وہ ہاتھ کھینچ کر ایک دم اندر آ گئی تھی، اب حال یہ تھا کہ عارفین کی طرف وارفتگی اور والہانہ پن انگڑائیاں لے رہا تھا جبکہ اروی کترائی ہوئی رہنے لگی تھی، اسے عارفین کے جذبات سے ڈر لگنے لگا تھا کہ آئندہ کیا ہوگا؟ وہ سب کچھ مجبوری کے تحت کر رہی تھی، لیکن محبت کا روگ نہیں پال سکتی تھی۔ بہتر یہ ہی تھا کہ ان کے رشتے کے رنگ کچے رنگ ہی رہتے، اگر گہرے ہو جاتے تو مٹتے مٹتے بھی اتنا وقت لے سکتے تھے۔ جبکہ وہ یہاں ایک ایگری منٹ کے تحت آئی تھی، دلوں کے رشتے پالنے نہیں۔

عارفین کو ایک ہفتہ ہو چکا تھا وہ آفس کے کسی کام سے واپس کر اچی آیا ہوا تھا۔ یہاں کا سارا کام منیجر صاحب نے سنبھالا ہوا تھا اور وقتاً فوقتاً رابعہ شیرازی بھی آفس کا چکر لگاتی رہتی تھیں، عارفین کی غیر موجودگی میں وہ اکثر آفس کا کام سنبھال لیتی تھیں، اور اس طرح عارفین کو آفس کی طرف سے ذرا کم ہی ٹینشن ہوتی تھی۔

”عارفین ہماری ایک جاننے والی ہیں، مسز فاروق انصاری ان کا بیٹا حال ہی میں اپنی سٹڈی سے فارغ ہوا ہے، وہ جاب کرنا چاہتا ہے چند روز پہلے ہی جاب کی تلاش میں یہاں آیا تھا، مگر میں نے اسے اپائنٹ نہیں کیا، لیکن اس سے کہہ دیا تھا کہ تم سے مشورہ کر کے بتاؤں گی، اب تم بتاؤ کہ تم کیا کہتے ہو؟ کیا تمہیں کسی ایمپلائز کی ضرورت ہے؟“ عارفین بھی مسز فاروق اور مسز فاروق انصاری کو جانتا تھا، مگر ان کا بیٹا کون تھا یہ ذہن میں نہیں آ رہا تھا۔

”نام کیا ہے اس کا؟“

”احمر انصاری۔“ رابعہ شیرازی کے بتانے پہ اسے یاد آ گیا تھا۔

”اوہ ہاں میری ملاقات ہوئی تھی اس سے کسی فنکشن میں، کافی اچھا لڑکا ہے، آپ اسے اپائنٹ کر لیجئے گا، باقی ساری ڈیٹیلز منیجر صاحب سمجھا دیں گے۔“ عارفین کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”کہاں جا رہے ہو؟“

”گھر.....“

”اتنی جلدی؟“

”جی وہ بابا جان آنے والے ہیں، انہوں نے مجھے تھوڑی دیر پہلے فون پہ بتایا ہے۔“

”جو کچھ تمہیں سمجھایا ہے تم بابا جان سے وہی کہنا، اوکے؟“ ان کی تاکید پہ وہ کچھ بھی کہے بغیر باہر نکل آیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ گھر پہنچا تو بابا



جان اس سے پہلے آئے بیٹھے تھے، اتنے دنوں بعد پوتے کو دیکھ رہے تھے۔ لہذا بازو پھیلا دیئے تھے اور وہ بھی خاصی گرجوٹی سے ملا تھا۔

”کیسے ہیں آپ؟ اور بی بی جان کی طبیعت کیسی ہے، اور مہر النساء آنٹی بھی ٹھیک ہیں نا؟“ وہ فردا فردا سب کا پوچھ رہا تھا۔

”اللہ کا کرم ہے بیٹا سب اچھے حال میں ہیں، تم اپنی سناؤ، زونکہ کیسی ہے؟“ بابا جان کی تان آخر کار زونکہ پہ آ کر ہی ٹوٹی تھی۔

”زونکہ بھی ٹھیک ہے، اس کے انگلیٹڈ جانے کے سارے انتظامات ہو چکے ہیں اور ڈاکٹر سے اپائنٹمنٹ بھی لے لی ہے۔“ یہ وہ جملہ تھا جو

عارفین نے رابعہ شیرازی کے حسبِ فضا ادا کیا تھا، ورنہ بابا جان کو اندھیرے میں رکھنے کا خیال ہی اسے بے چین کر ڈالتا تھا۔

مگر اس کی مجبوری تھی اگر ایسا نہ کرتا تو اس کی نام نہاد ماں گھر چھوڑ کر چلی جاتی اور وہ اپنی سوسائٹی میں کیا منہ دکھاتا؟ بیس سال ہو گئے تھے

ملنے ملانے والے ابھی تک اس کے باپ کے گھر چھوڑ دینے کی باتیں کرید کرید کر پوچھتے تھے اور اب اگر اس کی ماں بھی ایسا کر گزرتی تو وہ آئندہ بیس

سال ماں کے چلے جانے کی لوگوں کو وضاحتیں دیتا پھرتا..... اور یہی وہ نہیں چاہتا تھا، اسی لئے اس نے اتنا بڑا قدم اٹھالیا تھا اور اپنے ضمیر کی عدالت میں

بابا جان کا چور بن گیا تھا۔

”یہ تو بہت ہی اچھی بات ہے، اگر تم زونکہ کے ساتھ جانا چاہتے ہو تو تم بھی چلے جاؤ۔“

”نہیں بابا جان فی الحال تو وہ وہاں جا کر ڈاکٹر سے چیک اپ اور ٹریٹمنٹ کروائے گی، البتہ کچھ عرصہ بعد میں بھی چکر لگاؤں گا انگلیٹڈ

کا۔“ اس نے بابا جان کو ہر طرح سے مطمئن کر دیا تھا۔

”انشاء اللہ اللہ ہماری مراد ضرور پوری کرے گا، تمہاری بی بی جان نے بہت سی منتیں مان رکھی ہیں۔“ بابا جان بہت خوش لگ رہے تھے اور

ان کو خوش دیکھ کر عارفین کو اچھا لگا تھا۔



”اروئی! اروئی! کہاں ہو؟“ واپس گھر آتے ہی عارفین نے اسے پکارنا شروع کیا تھا، نہ جانے کب اور کیسے اس میں روایتی شوہروں

جیسے جراثیم پیدا ہونا شروع ہو گئے تھے، وہ ہی انداز و اطوار، وہ ہی لپک، وہی بے تائیاں تھیں اس میں..... گو کہ پہلے کبھی بھی اس نے ایسی حرکتیں نہیں

کی تھیں، لیکن اروئی کے معاملے میں وہ سچ محج ایک مشرقی خواہشات رکھنے والا مرد اور شوہر ثابت ہو رہا تھا۔

”اروئی۔“ وہ اسے ڈھونڈتے ہوئے اوپر بیڈروم میں چلا آیا تھا، لیکن اسے بستر میں لیٹا دیکھ کر ٹھنک کر اندر آ گیا تھا۔ اس نے اروئی کے

چہرے سے آہستگی سے کمل ہٹایا تھا اور اس کی نظریں اروئی کے سیاہ گھنے اور دراز بالوں میں الجھ کر رہ گئی تھیں، اس کے بال پورے بیڈ کا احاطے کئے

ہوئے لگ رہے تھے اور خود وہ گہری نیند سو رہی تھی، لیکن اس کے بالوں کی خوب صورتی ایسی تھی کہ عارفین انہیں چھونے سے خود کو روک نہیں پایا تھا۔ وہ

آج پہلی بار اس کے بالوں کو کھلے ہوئے دیکھ رہا تھا، پہلے اس نے نہ جانے کیسے چھپا کر رکھے ہوئے تھے۔ اس کی قربت کا احساس ہی تھا کہ اروئی کی

آنکھیں فوراً کھل گئی تھیں۔

”سر آپ؟“ وہ اسے دیکھ کر یک دم اٹھ بیٹھی تھی، لیکن بوکھلاہٹ میں یہ بھول گئی کہ وہ دوپٹے کے بغیر سوئی ہوئی تھی، کیونکہ اسے عارفین کی

واپسی کی ہرگز توقع نہیں تھی۔

”تمہیں سر پر از دینے کے لئے بغیر بتائے آیا ہوں۔“ عارفین نے کہتے ہوئے اروئی کے مدہوش سراپے سے اپنی نگاہیں چرانے کی بھرپور کوشش کی تھی، مگر دل و دماغ بار بار اس کے حلقے میں انک رہے تھے۔ سیاہ بال اس کے وجود کو ڈھانپے ہوئے تھے۔ موٹی موٹی براؤن آنکھیں ادھوری کچی نیند کی وجہ سے گلابی رنگ ہو رہی تھیں اور بغیر دوپٹے کے سراپا بہت ہی دل فریب سا نظارہ بخش رہا تھا۔ اروئی اس کی نظروں کا بدلا ہوا رنگ دیکھ کر فوراً سامنے سے اٹھ گئی تھی اور لپک کر اپنا دوپٹہ اوڑھ لیا تھا۔ مگر اس وقت تو وہ کتر اگئی تھی، لیکن رات جب وہ اس کے پہلو میں لیٹی تو دل بے تحاشا دھڑک رہا تھا۔ حالانکہ پہلے بھی اتنے عرصہ سے وہ ایک ہی بیڈ شیئر کرتے آرہے تھے، لیکن آج اروئی کے لئے بیڈ بھی جیسے پل صراط بن گیا تھا، نہ لیٹ سکتی تھی، نہ وہاں سے اٹھ سکتی تھی۔ وہ دم سادھے کروٹ بدل کر سونے ہی والی تھی کہ عارفین نے اسے بازو کے گھیرے میں لے کر قریب کر لیا تھا۔

”سر پلیز۔“ بے ساختہ احتجاج ابھرا۔

”ڈونٹ وری یار ہم میاں، بیوی ہیں۔“ اس کی گھمبیر سرگوشی اور مضبوط گرفت اروئی کی رگوں میں دوڑتا لہو نجد کر گئی.....، عارفین نے دوسرے ہاتھ سے سائیڈ ٹیبل پر رکھا لیپ بچھا دیا تھا۔



صبح فجر کی نماز کے بعد دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے تو سب کے لئے دل کھول کر دعا کی تھی، لیکن جب اپنے لئے کچھ مانگنے کی باری آئی تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے اور آہستہ آہستہ اس کے آنسو ہچکیوں میں بدل گئے، وہ ہلکے ہلکے روئے لگی تھی، اس کا جی چاہ رہا تھا وہ دھاڑیں مار مار کر روئے..... آج عارفین کی قربت کیا پائی تھی کہ ساتھ ہی کچھ کھونے کا دھڑکا بھی لگ گیا تھا۔ موسم بہار میں بھی اسے خزاں کی آمد کا خوف اپنے گھیرے میں لے چکا تھا، اس کا دل عارفین کی والہانہ چاہتوں سے بھی انکاری تھا، وہ ہر چاہت، ہر جذبے سے انکاری ہو رہی تھی، کیونکہ اسے پتہ تھا کہ انجام بہت برا ہوگا۔ آج اس کی آنکھیں ہی نہیں دل بھی رو رہا تھا۔ اس کی دھڑکنیں بہت سفاک آئیں سن رہی تھیں، لیکن اس کی سوچوں اور خدشوں سے ہٹ کے عارفین کچھ مطمئن تھا، کیونکہ وہ کوئی فیصلہ کر چکا تھا اور اس پہ پرسکون تھا۔

”کیا بات ہے اروئی؟ تم روتی رہی ہو کیا؟“ وہ آفس جانے کے لئے تیار ہو رہا تھا اور وہ نظریں جھکائے اس کی تیاری میں اس کی ہیلپ کر رہی تھی، جب بے ساختہ عارفین کی نظر اس کی سرخ ناک اور سوجے ہوئے پونٹوں سے ٹکرائی تھی اروئی اس کی نائی میچ کر کے رکھ رہی تھی، اس کے سوال پر رخ پھیر گئی تھی۔

”اروئی ادھر دیکھو میری طرف۔“ عارفین نے دائیں ہاتھ سے اس کا چہرہ اونچا کیا، اروئی کے آنسو آنکھوں سے رخساروں تک سفر طے کر آئے تھے۔

”کیا کچھ غلط ہو گیا ہے؟“ عارفین کا لہجہ بے حد سنجیدہ ہو چکا تھا، لیکن اس سے پہلے کہ وہ مزید کوئی سخت بات کرنا اروئی بے ساختہ اس کے سینے سے لگ کے ہلکے ہلکے کر رہ پڑی تھی اور وہ اس کے ہچکیوں سے لرزتے وجود کو کتنے لمحے بس دیکھتا رہ گیا تھا، وہ اس کے رونے کا سبب ڈھونڈ رہا تھا



اور جب ذہن وہاں تک پہنچا اسے بھی اروئی کے رونے کی وجہ سمجھ آ گئی تھی، جیسی اس کے گرد بازو حائل کرتے ہوئے اس کی کمر کو ہلکے سے سہلایا تھا۔  
 ”دیکھو تم ابھی سے اپنے آپ کو پریشان مت کرو، انشاء اللہ، اللہ بہتر حل نکالے گا، میں وعدہ کرتا ہوں میری جان میں تمہارے ساتھ ہوں اب ہمارا رشتہ کاغذی رشتہ نہیں ہے، اب تم میری زندگی میں شامل ہو چکی ہو اور میں تمہیں اتنی آسانی سے اپنی زندگی سے الگ نہیں کر سکتا..... مجھے اپنے لئے اور تمہارے لئے کوئی اسٹینڈ ضرور لینا پڑے گا اور میں انشاء اللہ ایسا ضرور کروں گا۔ ڈونٹ وری پلےز، چپ ہو جاؤ رونے سے کچھ اچھا نہیں ہوگا۔“ وہ اس کے بالوں کو تھپکتے ہوئے اسے تسلی دے رہا تھا اور وہ بمشکل اپنے آپ کو سنبھالتی ہوئی پیچھے ہٹ گئی تھی۔

”پلےز اروئی اتنی ٹینش مت لو، پانی پتھروں اور پہاڑوں کے درمیان سے بھی اپنی راہ بنا لیتا ہے اور گزر جاتا ہے، اور اسی طرح اگر رشتہ اور جذبہ سچا ہو تو وہ بھی پوری دنیا، پورے معاشرے میں اپنا آپ منوا لیتا ہے۔ ہمارا رشتہ ناجائز نہیں ہے، ہم میاں، بیوی ہیں، ہمارا تعلق کبھی نہیں ٹوٹے گا اور جس چیز سے تم ڈر رہی ہو میں اس چیز پہ مطمئن ہوں، مجھے خوشی ہوگی کہ تم میرے بچے کی ماں بنو گی اور یہ بچہ ہی ہوگا جو ہمارے رشتے کو مزید مضبوط بنائے گا، ایک دن تمہارے گھر والے اور میرے گھر والے اس حقیقت کو قبول کرنے پہ مجبور ہو جائیں گے، البتہ جس غلط طریقے سے اور غلط پلاننگ سے یہ سب کچھ ہوا ہے، وہ واقعی معافی کے قابل نہیں ہے، لیکن پھر بھی میں وقت آنے پہ تمہارے گھر والوں سے خود ہاتھ جوڑ کے معافی بھی مانگوں گا اور سب کچھ سچ سچ بھی بتاؤں گا، لیکن پلےز تم بس کچھ مت کرنا صرف اور صرف میرا ساتھ دینا، وقت اور حالات کے دھارے کو سمجھنے کی کوشش کرنا پلےز میری خاطر۔“ عارفین نے اسے بہت طریقے سے سمجھانے کی کوشش کی تھی، لیکن پھر بھی اس کے دل کا خوف اور دھڑکا کم نہیں ہوا تھا، البتہ وہ روتے روتے چپ ضرور ہو گئی تھی۔



”ارے مام آپ بے فکر رہیں سب کچھ ہماری خواہش کے مطابق ہی ہو رہا ہے، عارفین آج کل اس کے آگے پیچھے پھر رہے ہیں، لگتا ہے اس پہ فدا ہو چکے ہیں، بس سمجھیں ہمارا کام ہو ہی جائے گا۔“ زونکہ یہاں کی ساری صورت حال رابعہ شیرازی کے گوش گزار کر رہی تھی۔  
 ”کیا تمہیں اندازہ ہے کہ ان کے بیڈروم کے اندر کے تعلقات کیسے ہیں؟ اک دوسرے کے قریب بھی آتے ہیں کہ نہیں؟ یا پھر وہ دونوں ناکم کرتے پھر رہے ہیں؟“ رابعہ شیرازی کو اروئی کی طرف سے کوئی ڈرنی نہیں تھا، کیونکہ انہوں نے ہر طرح سے وارن کر کے بھیجا تھا۔ البتہ اصل پر ابلم عارفین کی طرف سے تھی کہ کہیں وہ ہی ڈنڈی نہ مار جائے۔

”ارے مام آپ بھی پاگل ہیں شاید، ذرا خود سوچئے آگ کے اوپر اگر پانی رکھ دیا جائے تو وہ ضرور ابلے گا، اسی طرح مرد اور عورت کا تعلق بھی آگ اور پانی جیسا ہی ہے یا تو آگ پانی بن جاتی ہے یا پھر پانی آگ بن جاتا ہے۔“ زونکہ نے رابعہ شیرازی کو معنی خیز اشارہ دیا تھا وہ اچھی طرح سمجھ گئی تھیں۔

”اوکے۔ پھر ٹھیک ہے اور تم سناؤ لندن جانے کی تیاری مکمل ہے نا؟“

”یس مام سب کچھ مکمل ہے بس گڈ نیوز کا انتظار ہے۔“ زونکہ بے زار ہوئی تھی۔

”ارے مائی سن گھبراؤ مت۔ انشاء اللہ سب کچھ تمہارے لئے ہی تو ہے۔“ انہوں نے اسے تسلی دی تھی اور زونکہ خاموشی سے سب سنتی رہی، وہ سچ مچ اپنے فرینڈ ز اور پارٹیز سے دور ہو کر بور ہو گئی تھی اور جلد از جلد یہاں سے نکلنا چاہتی تھی۔ اب اس کا نارگٹ انگلینڈ گھومنا تھا، اس کے دیگر رشتہ دار بھی وہاں تھے اور اس کے عیاش قسم کے کزن اس کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔

ٹھیک دو ماہ بعد ہی اروئی کو اپنی کنڈیشن بدلی ہوئی لگنے لگی تھی، اس کے کام کاج کرنے میں سستی اور کھانے پینے میں بے زاری آگئی تھی اور بہت سی چیزیں ایسی تھیں جنہوں نے اسے ڈاکٹر سے چیک اپ کروائے بغیر ہی مشکوک کر ڈالا تھا، وہ تو بری طرح سہم گئی تھی، جبکہ عارفین کا دل پھول کی مانند کھل اٹھا تھا، وہ شام ہوتے ہی اسے ڈاکٹر کے پاس لے گیا تھا اور پھر مثبت رپورٹ ملنے پر اس کی خوشی کی انتہا نہیں رہی تھی اور رفتہ رفتہ اس خوشی میں زونکہ اور رابعہ شیرازی بھی شریک ہو رہی تھیں، اور عارفین نے خوشی کے مارے بابا جان کو بھی فون کر ڈالا تھا۔

”مبارک ہو بابا جان آپ پر دادا بننے والے ہیں۔“ اس کی خوشی سنبھالنے نہیں سنبھل رہی تھی، آج اس کے دل کی مراد پوری ہو رہی تھی، آج اس کی مراد آگئی پہ لگا دھبہ دھل گیا تھا، اور دوسری طرف بابا جان نے باقاعدہ بھنگڑا ڈالا تھا۔

”شاباش میرے جوان تم نے ہمیں پر پوتے کی نہیں بلکہ زندگی کی دائمی خوشیوں کی نوید سنائی ہے، تم نے ہمارے دل کا ارمان پورا کیا ہے جیتے رہو، آباد رہو۔“ وہ کہتے کہتے اندر سے اداس بھی ہو گئے تھے۔

”کیا ہو بابا جان، آپ چپ کیوں ہو گئے؟“ وہ پریشان ہوا تھا۔

”نہیں بیٹا ایسی کوئی بات نہیں ہے، تم سناؤ زونکہ سے رابطہ ہوا، وہ کیسی ہے؟“ وہ بات اور لہجہ بدل گئے تھے۔

”جی وہ ٹھیک ہے، بہت جلد آپ سے بات کرے گی۔“ عارفین زونکہ کے ذکر پہ کچھ مدھم پڑ گیا تھا، تب ہی اس کی نظر اروئی کی سمت اٹھی، وہ بے حدست اور اداس قدموں سے سیزھیاں چڑھتی اوپر بیڈروم میں جا رہی تھی۔ اروئی کی اداسی اور چپ وہ اچھی طرح سمجھتا تھا۔ اس نے تھوڑی دیر بات کرنے کے بعد فون بند کر دیا تھا۔

اروئی بہت دیر سے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے ایک ہی زاویے سے بیٹھی تھی، اس کی نظروں کا مرکز کوئی غیر مرئی نقطہ تھا، جبکہ عارفین کمپیوٹر میں کوئی ضروری کام کرتے ہوئے بار بار گردن موڑ کے اسے دیکھ رہا تھا۔ جب تک وہ بیڈ پہ نہیں آتا تھا اروئی سوئی نہیں تھی، اسے عارفین سے پہلے سو جانا کچھ مناسب نہیں لگتا تھا، ابھی بھی وہ اس کے انتظار میں بیٹھی تھی اور وہ جلدی جلدی کام بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر پھر بھی اسے ایک گھنٹہ لگ ہی گیا تھا۔ جب وہ بستر پہ آیا اروئی بری طرح تھک چکی تھی۔

”کیا بات ہے، تم اتنی اداس کیوں ہو؟“ اپنی ناگوں پہ کمبل پھیلاتے ہوئے وہ اس کی سمت متوجہ ہوا تھا۔

”کچھ نہیں بس نیند آ رہی ہے۔“ اروئی سیدھی ہو کر لیٹ گئی تھی اور کمبل سینے تک اوڑھ لیا تھا۔



”نیند تو اب آرہی ہے جبکہ تم تو صبح سے ہی اداس اور چپ۔“

”پلیز سر آج کچھ مت کہیں۔ سونے دیں مجھے۔“ وہ عارفین کی بات درمیان سے کاٹتے ہوئے دو ٹوک خفگی بھرے لہجے میں بولی تھی۔  
”لیکن اروی تم۔“

”سر پلیز۔ کیا آج آپ میری بات نہیں مان سکتے؟“ وہ بھیکے سے انداز میں بولی تھی اور عارفین اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے چپ ہو گیا تھا۔ اروی اس کے بازو پہ سر رکھے لیٹی تھی، پلکیں موند کر سونے کی کوشش کی تو کئی آنسو خاموشی سے عارفین کے بازو پہ جذب ہونے لگے تھے۔ بہت دیر تک وہ بے آواز روتی رہی اور بہت دیر تک وہ اس کے بالوں کو انگلیوں سے سہلاتا رہا تھا۔ رات گئے جب وہ سوئی تو وہ آہستگی سے اس کی پیشانی پہ بوس دے کر خود بھی سونے کی تیاری کرنے لگا تھا۔

اس خوشخبری کے فوراً بعد ہی زوندا انگلینڈ چلی گئی تھی اور اب گھر میں وہ دونوں اکیلے ہوتے تھے۔ اروی کی پریکٹس کے چند روز بعد اچانک اروی کی امی اور بہروز بھائی نے اروی کو ایک بار گھر آنے کی فرمائش کی تھی۔ وہ لوگ اس سے ملنا چاہتے تھے، اس کے بغیر اداس تھے اور اداس تو اروی بھی تھی۔ لہذا اس کے موڈ کے پیش نظر عارفین نے اسے جانے کی اجازت دے دی تھی، لیکن اروی نے کچھ ہچکچائی تھی۔ بے شک ابھی وہ جسمانی لحاظ سے پریکٹس محسوس نہیں ہوتی، لیکن پھر بھی خود اس کو تو پتہ ہی تھا، وہ ایسی حالت میں گھر جاتے ہوئے ڈر رہی تھی۔

”ڈونٹ وری یار، کچھ نہیں ہوگا، میں بھی ایک ہفتہ کے لئے کراچی جا رہا ہوں، تم بھی میرے ساتھ چلو میں تم سے کاٹیکٹ کرتا رہوں گا اور ایک ہفتے بعد ہم دوبارہ واپس آجائیں گے۔“

”لیکن سر میر اس حالت میں گھر جانا مناسب نہیں ہوگا۔“ وہ آمادہ نہیں ہو رہی تھی۔

”دیکھو اروی تمہیں یہاں آئے ہوئے چار، پانچ ماہ ہو چکے ہیں، اس لئے تمہارے گھر والے تم سے ملنے کے لئے اداس اور پریشان ہیں اور ابھی تمہاری ڈیلوری میں مزید چھ ماہ باقی ہیں تم خود سوچو تم اپنے گھر والوں کو اگلے چھ ماہ تک کیسے ٹالتی رہو گی؟ جبکہ میرے خیال میں تمہیں ان دنوں ان سے مل آنا چاہیے، تاکہ اگلے چھ ماہ تم آرام سے یہاں گزار سکو، اس طرح تمہارے گھر والے بھی مطمئن ہو جائیں گے اور دوبارہ تمہیں اتنی جلدی ملنے کا اصرار بھی نہیں کریں گے، پھر تم زیادہ کام کا بہانہ کر کے آسانی سے انہیں ٹال سکتی ہو۔“ عارفین کا آئیڈیا حقیقتاً کافی اچھا اور حقیقت کے قریب تھا۔ اروی کو حوصلہ کرنا ہی پڑا تھا اور پھر جانے سے پہلے اس نے گھر والوں کے لئے تھوڑی بہت شاپنگ بھی کی تھی۔ بھابی، سونیا، سارہ، امی اور بہروز بھائی کے لئے چھوٹے موٹے گفٹ لئے تھے اور عارفین کے ساتھ کراچی آگئی تھی۔



اروی گھر پہنچی تو اسے سر پر سزا ملا تھا، بھائی کے ہاں بیٹا ہوا تھا، لیکن ان لوگوں نے اروی کو بتایا نہیں تھا۔

”ہائے امی سچ کہہ رہی آپ؟ کہاں ہے میرا بیٹا؟“ وہ تیزی سے کمرے کی سمت لپکی تھی اور پھر چھوٹے سے ننھے منے سے عمر کو دیکھ کر اس کا دل چل گیا تھا۔ اسے گود میں اٹھا کر بے تحاشا پیار کر ڈالا تھا۔

”ارے پاگل دم تو لے لو اس کو بھی بوکھلا دیا ہے تم نے۔“ عمر گہرا کر رو دیا تو امی نے اروی کو مسکراتے ہوئے چپٹ لگائی تھی۔

”امی اتنا پیارا ہے یہ۔“ اس کے لہجے میں بچوں کی سی خوشی بول رہی تھی، شمیمہ بھابی اور امی مسکرائیں، لیکن نہ جانے کیوں عمر کو بھابی کے پہلو میں لٹاتے ہوئے اروی کے چہرے کی ہنسی تھم گئی تھی، اسے شاید دھیان کی طنائیں اپنی ذات کی طرف کھینچ کر لے گئی تھیں۔ وہ بھی تو ماں بننے والی تھی، اس کے اندر کی متا بھی تو آج کل عروج پر تھی، وہ بھی اس رتبے کو پہنچنے والی تھی۔ لیکن اس کی متا کا انجام کیا ہونا تھا؟ اور کس امتحان سے گزرنا تھا؟ یہ سوچ کر ہی ہونٹ چپ ہو گئے تھے۔ مسکراہٹ چہرے سے الگ ہو گئی تھی اور ہلکے خوف کی پرچھائیں لہرانے لگی تھیں۔

”بھائی سے نہیں ملو گی؟“ امی نے اس کا کندھا بلایا تھا۔

”ہوں ملتی ہوں ابھی۔“ وہ پلٹ کر کمرے سے باہر نکل آئی تھی اور پھر کافی دیر تک بہروز بھائی کے پاس بیٹھی رہی، شام کو یسری آپی بھی اس سے ملنے کے لئے آگئی تھیں، گھر میں خوب رونق لگ گئی تھی، لیکن اروی اپنے آپ کو اندر ہی اندر چور محسوس کر رہی تھی اور ساتھ ہی اپنی حالت کا بھید کھل جانے کا دھڑکا لگا ہوا تھا اور ساتھ میں اداسی بھی تھی۔ عارفین اسے کال کرتا رہا تھا۔ مگر وہ سب کے درمیان کال نہیں سن سکتی تھی، اس لئے ان کی بات چیت میسجیز میں ہوتی رہی، دونوں رات گئے تک میسج کرتے رہے تھے۔



اروی کے گھر والے سچ مچ سے مل کر خوش اور مطمئن ہو چکے تھے اور واپسی پہ وہ بھی کچھ ریلیکس تھی۔

”کیسا گزرا ایک ہفتہ؟“ ملیں میں بیٹھے تو عارفین نے پہلا سوال یہ ہی کیا تھا۔

”ڈرڈر کر گزرا ہے۔“ وہ اعتراف کر رہی تھی۔

”اوہ کم آن میری جان، اتنا ڈرنا بھی ٹھیک نہیں ہوتا، جتنا ڈرو گی، دنیا اتنا ہی ڈرائے گی۔“ عارفین نے مسکراتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑ کر آہستگی سے دبایا تھا۔

”اوہ آج تو کیونکس بھی نظر آ رہی ہے؟“ اس کی نظر اروی کے ناخنوں سے ٹکرائی تو بے ساختہ دلچسپی کا اظہار کیا تھا اور اروی جھینپ گئی تھی۔ ”یہ کیونکس میں سارہ کے لئے لے کر گئی تھی اور اس نے ضد کر کے میرے ناخنوں پہ لگا دی۔“

”ہوں اچھے لگ رہے ہیں، آئندہ بھی لگایا کرو۔“ وہ اس کی تعریف پہ نظریں جھکا گئی تھی۔ باقی کا سفر بھی وہ اسے چھوٹی چھوٹی باتوں سے کنفیوژ کرتا ہوا آیا تھا۔

”اپنے بچے کا نام کیا رکھو گی؟“

”میرا بچہ؟“

”ہاں یار تمہارا اور میرا بچہ..... چاہے وہ دنیا کے کسی بھی کونے میں چلا جائے رہے گا تو میرا اور تمہارا ہی نا۔“ عارفین کی بات پہ اس نے چونک کر دیکھا تھا، اس کی بات اروی کے دل کو لگی تھی، واقعی اس کا بچہ چاہے جہاں بھی رہتا..... تھا تو اس کا ہی نا؟



”ارے یار بتاؤ نا کیا نام رکھو گی؟“ اس نے اصرار کیا تھا۔

”اگر میں نام رکھوں تو میں ”روحان“ نام رکھوں گی اور اس کا نک نیم ”حانی“ ہوگا۔ اروئی مسکراتے ہوئے بتا رہی تھی۔

”ناکس یار یہ نام بہت اچھا ہے؟“ وہ اسے محبت پاش نظروں سے دیکھ کر بولا تھا اور اروئی اپنے چہرے پہ اس کی بے تاب نگاہوں کا قص محسوس کر کے چہرہ جھکا گئی تھی۔



یہ نو ماہ عارفین نے اروئی کا پل پل دھیان رکھا تھا۔ اس کے کئی کام وہ خود کر دیتا تھا۔ اس کے کھانے پینے سے لے کر سونے جاگنے اور اٹھنے بیٹھنے پہ بھی بھرپور توجہ دیتا تھا۔ آج بھی وہ اسے ناشتہ کروا کے کمرے میں بیڈ تک چھوڑ کے گیا تھا۔ یہاں تک کہ اسے لیٹنے میں سہارا دیتا تھا اور کمبل بھی خود ہی اس کے اوپر اوڑھایا تھا۔

”کوئی بھی ضرورت ہو تو فوراً ملازمہ کو رنگ کر دینا اور اگر کوئی مسئلہ، کوئی تکلیف ہو تو

مجھے کال کر لینا، باہر بہت سردی ہے، نیچے مت آنا۔“ وہ آفس جاتے ہوئے بار بار اسے تاکید کر رہا تھا۔

”سر آپ آج آفس مت جائیں میرا دل گھبرا رہا ہے۔ آپ میرے پاس رہیں۔“ اروئی نے عارفین کا بازو آستین سے پکڑ لیا تھا۔

”میری جان میں جلدی آ جاؤں گا بس تھوڑا سا کام ہے، صرف دو گھنٹے کی بات ہے۔“ وہ اس کا گال تھپک کر اپنی آستین چھڑا کر اٹھ گیا تھا۔

”دو گھنٹے بہت ہوتے ہیں سر۔“ وہ روہانسی ہو گئی تھی۔

”ہاں میں جانتا ہوں دو گھنٹے بہت ہوتے ہیں، لیکن.....“ عارفین بھی بے بس تھا۔ کیونکہ وہ جس پروجیکٹ پہ کام کر رہا تھا آج اس پروجیکٹ کا مالک کراچی سے وزٹ کے لئے آ رہا تھا۔ اس لئے عارفین کی موجودگی بے حد ضروری تھی۔ اروئی مزید کچھ بھی کہے بغیر خاموشی سے کروٹ بدل کر لیٹ گئی تھی اور عارفین بھی مجبوراً اٹھ کر باہر نکل گیا تھا۔ اروئی کا خدشہ بھی آخر سچ ثابت ہوا تھا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد اسے درد سے اپنی حالت غیر ہوتی محسوس ہوئی تھی۔ پہلے تو وہ ضبط کر کے لیٹی رہی، لیکن جب درد نے رگوں کو کاٹنا شروع کیا تو برداشت کا پیمانہ چھلک گیا تھا۔ اس کی چیخ سن کر ملازمہ بھاگتی ہوئی اوپر آئی تھی۔

”اوہ بیگم صاب آپ تو بوت بیماراے۔“ ملازمہ پٹھانی تھی، اسے دیکھ کر گھبرا گئی تھی۔

”تم..... تم فون..... کرو سر کو۔“ اس نے بمشکل اسے فون کرنے کہا تھا۔

”صاب جی بیگم صاب بوت بیماراے، بڑا خراب حالت ہے بیگم صاب کا۔“ ملازمہ کی فون کال پہ عارفین اٹے قدموں واپس گھر بھاگا تھا، لیکن اسے آتے آتے بھی تقریباً تیس چالیس منٹ لگ گئے تھے۔ رات برف باری ہوئی تھی، اس لئے کئی راستے بلاک تھے۔ جیسے ہی اس نے گھر میں قدم رکھا اسے اروئی کی رونے اور چیخ کی آواز سنائی دی، لیکن اس کے چہنچہ تک وہ نڈھال ہو کر حواس کو بچا چکی تھی۔

”اروئی آنکھیں کھولو۔“ وہ گھبرا چکا تھا۔

”صاب پہلے ای بوت دیر ہو چکا ہے آپ بگم صاب کو گاڑی میں ڈالو ام سامان لے کے آتا ہے۔“ ملازمہ نے اسے مزید دیر کرنے سے روکا تھا، تبھی عارفین اسے اٹھا کر تیزی سے باہر نکل گیا تھا۔



اروئی ڈیوری کے بعد ابھی ہوش میں بھی نہیں آئی تھی کہ رابعہ شیرازی بھی مری پہنچ گئی تھیں اور زونکہ کو بھی پتہ چل گیا تھا۔  
 ”ماشاء اللہ بہت ہی پیارا ہے میرا پوتا۔“ رابعہ شیرازی نے سرشاری سے کہا تھا، لیکن عارفین کا دھیان اروئی کی سمت تھا۔  
 ”ڈاکٹر یہ کب تک ہوش میں آجائیں گی؟“ وہ ڈاکٹر کے پیچھے کمرے سے باہر نکل آیا تھا۔

”یہ ڈرپ ختم ہونے تک انشاء اللہ وہ ہوش میں آجائیں گی، زیادہ پریشانی والی بات نہیں ہے۔“ ڈاکٹر صاحبہ نے اسے تسلی دی تھی۔ اور واقعی آدھے گھنٹے بعد وہ ہوش میں آگئی تھی۔

”مبارک ہو اروئی ہمارے ہاں بیٹا ہوا ہے۔“ عارفین اس کے قریب آتے ہوئے بہت محبت سے بولا تھا اور اروئی کے لب بے ساختہ ہلکی سی مسکراہٹ کو چھو بیٹھے تھے۔ مگر صرف ایک پل کے لئے۔

”عارفین تم نے اپنے بابا جان کو بتایا کہ وہ پردادا بن گئے ہیں؟“ رابعہ شیرازی کی آواز پہ اروئی نے چونک کر دیکھا تھا، وہ کمرے کے ایک کونے میں لگے صوفے پر بیٹھی تھیں اور بچہ ان کی گود میں تھا۔ رابعہ شیرازی کی صورت نظر آئی تو ان کا پلان بھی دماغ میں گھوم گیا تھا۔  
 ”میرا بچہ؟“ اروئی کا دل کسی نے منھی میں لے کر بھیج ڈالا تھا۔ اس کے سینے سے درد سے اک کراہ نکلی تھی۔

”کیا ہوا تم ٹھیک تو ہو؟“ عارفین اس کی زرد ہوتی رنگت دیکھ کر جلدی سے اس کا ہاتھ تھام چکا تھا۔  
 ”میرا دل گھبرا رہا ہے۔“ وہ لیٹے لیٹے ہانپنے لگی تھی اور عارفین بدحواسی میں ڈاکٹر زکی سمت لپکا تھا اس کی حالت دیکھ کر رابعہ شیرازی بھی پریشان ہو گئی تھی۔

”ان کا بی بی لو ہو گیا ہے شاید۔“ نرس نے ڈاکٹر کو بتایا تھا، لیکن اس کی طبیعت بگڑتی جا رہی تھی۔ بروقت ٹریٹ منٹ سے ڈاکٹر نے کنٹرول پالیا تھا۔



زونکہ کے واپس آنے تک روحان اروئی کے پاس ہی رہا تھا۔ وہ آٹھ دن اروئی نے مسلسل حافی کو اپنی نظروں کے سامنے رکھا تھا اور ایک سیکنڈ بھی ادھر سے ادھر نہیں ہونے دیا تھا، لیکن ٹھیک آٹھ دن بعد زونکہ واپس آگئی تھی۔

”سر پلیز ابھی..... ابھی کچھ دن اور اسے میرے پاس رہنے دیں۔“ جب روانگی کا وقت آیا اروئی رو پڑی تھی۔  
 ”اروئی، حافی تمہارا ہے صرف تمہارا..... بس کچھ دن کی بات ہے، تم اس کو مام کے پلان کے مطابق گھر جانے دو۔ میں جلد ہی کوئی اچھا سامو قع دیکھ کر بابا جان کو بچ بچ بتا دوں گا اور میں خود بابا جان کے ساتھ تمہارے گھر آؤں گا، تمہارے گھر والوں کو سب کچھ خود بتاؤں گا۔“



”سر پلیز مجھے کچھ نہیں سننا، مجھے کوئی تسلی مت دیں۔ مجھے کچھ نہیں چاہئے، صرف چند دن پلیز، چند دن اور اسے میرے پاس رہنے دیں۔ میں نے تو ابھی اسے ٹھیک طرح سے دیکھا بھی نہیں ہے۔ ابھی تو میری متا کی پیاس بھی نہیں بجھی۔ ابھی تو میں نے اس کا کوئی کام بھی اپنے ہاتھوں سے نہیں کیا۔ پلیز سر مجھ پر ترس کھائیں، اسے میرے پاس رہنے دیں، صرف چند دن اور۔“ ارونی حانی کو بانہوں میں بچھنے التجائیہ انداز میں کہتی بلک بلک کر رو پڑی تھی۔ عارفین نے آہستگی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر دیا تھا۔

”عارفین یہ کیا نالک ہو رہا ہے؟ تم ابھی تک حانی کو لے کر نیچے کیوں نہیں آئے؟“ رابعہ شیرازی ایک دم دندنائی ہوئی اندر داخل ہوئی تھیں اور اک دھاڑ سے دروازہ کھلنے کی آواز پہنچا کر حانی کی دم ڈر کے رو پڑا تھا۔

”مام ہم چند دن اور رک جاتے ہیں، تب تک ارونی بھی ریلیکس۔“

”بس بہت ہو گیا یہ نازخرو، تمہارے بابا جان کو پتہ چل چکا ہے کہ ہم لوگ آج ہی کراچی پہنچ رہے ہیں، وہ بھی گاؤں سے نکل چکے ہوں گے اور لڑکی تم کیوں اتنے ٹسوے بہا رہی ہو؟ تمہیں شروع سے پتہ تو تھا کہ یہ بچہ تمہارا نہیں ہے، اس کو پیدا کرنے کی تم ساری قیمت ایڈوانس لے چکی ہو۔ ہم نے اس بچے کے لئے تمہیں ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں دیئے ہیں اور شکر ادا کرو ہم نے تم سے ناجائز نہیں بلکہ جائز کام کروایا ہے، باقاعدہ نکاح کروایا تھا تمہارا اور کچھ نہ سہی لیکن ضمیر کی عدالت میں تو سرخرو ہونا تم۔ جس طرح تم ہمارے پلان کا کسی کے سامنے ذکر نہیں کرو گی اس طرح ہم بھی تمہارے گھر والوں سے سب کچھ راز رکھیں گے..... لہذا بہتر یہی ہے کہ تم سب کچھ بھول جاؤ، تم لوگوں کے درمیان جو کچھ ہوا وہ ایک ڈرامہ تھا اور اب اس ڈرامے کا اینڈ ہو چکا ہے، بہت جلد تمہیں طلاق کے پیپر ز بھی مل جائیں گے۔ تم اپنی پسند سے جہاں چاہے شادی کر سکتی ہو بلکہ ہم بھی تمہاری شادی میں ضرور شرکت کریں گے۔ اس وقت ہمیں دیر ہو رہی ہے، تم بھی تیار ہو کر جلدی نیچے آ جاؤ۔“ رابعہ شیرازی ہر بات کاٹ دار اور دونوک لہجے میں کہتی ہوئیں ارونی کے ہاتھ سے حانی کو چھٹ کر آندھی طوفان کی طرح باہر نکل گئی تھیں اور عارفین ساکت بیٹھی ارونی کو دیکھتا رہ گیا اور پھر لئے پٹے قدموں سے وہ بھی واپس آ گئی تھی۔

ارونی نے وہ کام، وہ سودا کیا تھا جو کوئی بھی عورت اتنی آسانی سے نہیں کر سکتی تھی، اس نے اپنے بھائی کی خاطر اپنا کلیجہ انگاروں پہ ڈال دیا تھا اور بدلے میں اسے کیا ملا تھا؟ بھائی کی زندگی اور اس زندگی سے جڑے بہت سے متعلق..... وہ واپس تو آ گئی تھی، مگر بہت کچھ پیچھے چھوڑ آئی تھی۔

ارونی اتنا سب کچھ ہو جانے کے بعد عارفین کے ساتھ جاب نہیں کر سکتی تھی، لیکن وہ اتنی جلدی اور اتنی آسانی سے یہ جاب چھوڑ بھی نہیں سکتی تھی، کیونکہ اگر وہ فوری طور پہ جاب چھوڑتی تو بہت سے لوگوں کے ساتھ ساتھ اس کے گھر والے بھی سوال کرتے اور وجہ پوچھتے اور دوسری بات یہ کہ اسے اتنی جلدی ایسی اچھی جاب دوبارہ ملنا ناممکن تھا۔ لہذا بہتر یہی تھا کہ وہ کچھ عرصہ اور یہاں کام کرتی اور اپنے لئے کوئی نئی جاب تلاش کرتی۔ پورا ایک ماہ اس نے گھر پہ خوب ریسٹ کیا تھا اور تب جا کر جاب دوبارہ جوائن کرنے کی تیاری پکڑی تھی۔

”بیٹا کچھ دن اور آرام کر لیتیں، اتنی کمزور ہو چکی ہو تم، اپنی آنکھیں دیکھو، حلقے پڑ گئے ہیں، مجھے تو لگتا ہے تم وہاں دن رات بس کام کرتی رہی ہو، ان لوگوں نے تمہیں کھانا پینا ہر گز نہیں دیا۔“

”ایسی کوئی بات نہیں ہے امی، بس اپنے گھر سے دور رہا جائے تو یہ ہی حال ہوتا ہے۔“ اس نے آہستگی سے کہہ کر ماں کی فکر دور کی تھی۔



”مے آئی کم ان میم؟“ وہ اپنے کیمبن میں بیٹھی تھی جب احمر انصاری دستک دے کر اندر آ گیا تھا۔

”جی فرمائیے؟“

”میم میں آپ کا کو لیگ ہوں، میں بھی یہاں جاب کرتا ہوں۔“ احمر کو ہر ایک سے ہیلو ہائے کرنے کا شوق تھا۔ جی بھی وہ ہر ایک سے

ناگوار سیٹا رہتا تھا۔

”آپ یہاں جاب کرتے ہیں، لیکن کب سے؟ کیا نام ہے آپ کا؟“ ارووی کو حیرانی ہوئی تھی۔

”تقریباً سات آٹھ ماہ ہو چکے ہیں، اسی لئے آپ سے ملاقات نہیں ہو سکی تھی، منیجر صاحب سے معلوم ہوا تھا کہ عارفین سر کی ایک پی اے

بھی ہیں جو آج کل مری براچ میں کام کر رہی ہیں۔“ احمر انصاری پہلی ملاقات میں ہی کافی باتونی لگ رہا تھا، ویسے تو وہ ہر لحاظ سے اچھا لڑکا لگ رہا تھا، بس خواہ مخواہ بے تکلف ہونے کی عادت غلط تھی۔

”مسٹر احمر آپ اس وقت اپنے کیمبن میں جاییے سر آنے والے ہوں گے۔“ اس نے آہستگی سے کہا اور دروازے سے فائلیں نکالیں۔

”جی میم، پھر ملاقات ہوگی، بائے۔“ وہ ہاتھ ہلا کر چلا گیا تھا۔ اتنے میں عارفین کی آمد بھی ہو چکی تھی۔

وہ آج ارووی کو آفس میں دیکھ کر ٹھہر سا گیا تھا، لیکن اس نے آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی بھی زحمت نہیں کی تھی۔

”کیسی ہو ارووی؟ تمہاری طبیعت کیسی ہے اب؟ تم نے اتنے دنوں سے اپنا سیل آف کیوں کر رکھا ہے؟“ وہ آفس روم میں آئی تو عارفین

بے تابی سے پوچھتا چلا گیا تھا۔

”جی۔ سر میں بالکل ٹھیک ہوں، آپ پلیز ان فائلز کو ایک بار پھر چیک کر لیں۔“ وہ مختصر سا جواب دے کر کام کی بات پہ آ گئی تھی۔

”ارووی تم مجھ سے کیوں خفا ہو؟ اس میں میرا کیا قصور ہے؟ یہ سب تو ہونا ہی تھا، میں تو اب بابا جان کو اصل بات بتانے کی کوشش میں

ہوں، بس کوئی مناسب موقع ہاتھ نہیں آ رہا۔“

”سر میں نے آپ سے کچھ کہا؟“ وہ سپاٹ لہجے میں بولی تھی۔

”یہ تو براہم ہے کہ تم کچھ کہہ نہیں رہیں۔“ وہ جھنجھلا گیا تھا۔

”سر میں کچھ کہوں گی بھی نہیں، جو ہو گیا، سو گیا بس سینے میں ہلکا سا درد جاگتا ہے، تو اسے تھپک تھپک کر سلا دیتی ہوں۔“

”ارووی مایوس مت ہو، حانی تمہارا ہے اور صرف تمہارا ہے، بلکہ حانی کے ساتھ ساتھ میں بھی تمہارا ہوں، تم میری زندگی ہو، اور ہم نے

زندگی مل کر گزارنی ہے، بس اس کے لئے زندگی کی تمام راہیں صاف کرنا ضروری ہے اور میں بہت جلد ایسا ہی کروں گا۔“ وہ اسے یقین دلا رہا تھا۔ مگر

وہ کوئی بات بھی دلچسپی سے سننے بغیر اپنے کام کی فائل اٹھا کر چلی گئی تھی اور پھر ایسا روز ہونے لگا تھا وہ پکارتا رہتا تھا وہ سنی ان سنی کر ڈالتی تھی۔





آج بہروز بھائی کوڈاکٹر کے پاس چیک اپ کے لئے جانا تھا، اس لئے اروئی آفس سے ذرا پہلے ہی آگئی تھی، دوپہر دو بجے کا وقت تھا، وہ پیدل چلتی ہوئی ایک بس سٹاپ پہ آرکی تھی، اس بس سٹاپ سے ایک روڈر ہائشی ایریا کی طرف نکلتا تھا، ایک بازار کی طرف اور ایک سنان علاقے کی طرف، جہاں لوگوں کا بہت ہی کم آنا جانا ہوتا تھا، اس لئے اس طرف ٹریفک بھی نہ ہونے کے برابر تھا۔ اروئی کو وہاں کھڑے ابھی چھ، سات منٹ ہی گزرے تھے کہ اسے نسوانی چیخوں کی آواز ماحول کو چیرتی ہوئی سنائی دی تھی۔ اس نے ٹھک کر آگے پیچھے دیکھا، لیکن اس پاس کوئی بھی نظر نہیں آیا تھا۔ مگر چیخنے کی آواز مسلسل آرہی تھی، بلکہ رفتہ رفتہ قریب آتی سنائی دے رہی تھی، تبھی اروئی نے پلٹ کر پچھلے روڈ کی سمت دیکھا، جہاں اس دوپہر اور تیز دھوپ میں ایک لڑکی ننگے سر اور ننگے پاؤں بھاگتی ہوئی نظر آئی تھی اور پھر اس کے پیچھے دو، تین لڑکے بانیک پہ آتے نظر آئے تھے، اروئی چند سیکنڈز میں ہی ساری پھویشن سمجھ گئی تھی۔

”اے لڑکی اسے ہماری طرف بھیج ورنہ ایک کی بجائے دو شکار کھلیں گے ہم۔“ بانیک پہ سوار ایک لڑکے نے کافی خباثت سے کہا تھا اور اروئی نے اس آواز کے تعاقب میں کافی حیرت سے مڑ کر پیچھے دیکھا تھا۔

”جرار.....؟“ بھتا شدید جھکا کر اروئی کو لگا تھا اتنا ہی شدید جھکا کر ارکو بھی لگا تھا اس کا رنگ اڑ گیا تھا۔

”اروئی؟“ اندر سے وہ بری طرح گھبرا گیا تھا جبکہ دوسرے دونوں لڑکے جرار کی حالت سے بے خبر نہ جانے کیا اول فول بک رہے تھے۔

”خبردار جو تم نے اس کو ہاتھ بھی لگایا تو.....“ اروئی کی غضب ناک آواز پہ وہ ٹھک گیا تھا۔

”اوئے کیوں نہ ہاتھ لگاؤں؟“ وہ لڑکا معنی خیزی سے بولا تھا اور جواباً اروئی نے ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پہ دے مارا تھا۔

”مسٹر جرار تم اپنی کمینگی میں اس حد تک جا چکے ہو مجھے اندازہ نہیں تھا جی چاہ رہا ہے تمہارے منہ پہ تھوک کر چلی جاؤں..... تم لوگوں کی عزتیں داؤ پہ لگاتے پھر رہے ہو گھٹیا بے غیرت انسان تمہیں ذرا شرم نہیں آئی کسی کی بہن اور بیٹی کی عزت پہ ہاتھ ڈالتے ہوئے؟“ وہ اس لڑکی کو تھپڑ مار کر سیدھی جرار کے سامنے آکھڑی ہوئی تھی اور ان دونوں لڑکوں کے ساتھ ساتھ وہ لڑکی بھی حیرت سے دیکھنے لگی تھی کہ وہ دونوں اک دوسرے کو جاننے ہیں؟“

”اروئی..... وہ..... وہ یہ لڑکی۔“ جرار سے کوئی بات کوئی بہانہ نہیں بن پڑا تھا۔

”شٹ اپ اپنی غلیظ ناپاک زبان سے میرا نام بھی مت لینا بد کردار انسان اور آئندہ کبھی ہمارے گھر کا رخ بھی مت کرنا، اور ہاں آئندہ کسی کی عزت سے کھیلنے سے پہلے ذرا یہ سوچ لینا کہ تمہاری اپنی بھی کوئی بہن ہے اگر اسی طرح وہ اس سڑک پہ ننگے سر بھاگ رہی ہو تو تمہیں کیسا لگے گا؟ لیکن میرا خیال ہے تم جیسے بے غیرت کو اپنی بہن کی بھی پروا نہیں ہوگی۔“ وہ انتہائی بلند آواز سے حقارت سے کہتی ہوئی جرار کے پیچھے بیٹھے لڑکے سے اس لڑکی کا دوپٹہ جھپٹ کر واپس پلٹ گئی تھی۔ وہ لڑکی کالج کی سٹوڈنٹ تھی روزانہ یہ لوگ اس کا پیچھا کرتے تھے لیکن وہ اپنی دوستوں کے گروپ کے ساتھ ہوتی تھی اس لئے کبھی ہاتھ نہیں آتی تھی لیکن آج اتفاقاً وہ اکیلی کالج سے واپس جا رہی تھی کہ ان لوگوں کے ہتھے چڑھ گئی اور قسمت اچھی تھی کہ اس کا ناکرا اروئی سے ہو گیا تھا ورنہ وہ ان تین شیطان صفت لوگوں سے بچنے والی نہ تھی بس اللہ نے اسے بچانے کا وسیلہ بھیج دیا تھا اور یہ اس کے

رب کا بہت بڑا کرم تھا۔

اس لڑکی کے گھر والے اروئی کے مشکور ہو رہے تھے اور اروئی کو واپس اپنے گھر آتے ہوئے شام ڈھل چکی تھی۔

”کیا ہوا بیٹا اتنی دیر کیوں کر دی؟ تمہیں پتہ تو تھا کہ بہروز کا آج چپک اپ ہونا تھا؟“ امی پریشانی سے کہہ رہی تھیں۔

”بس وہ آفس میں کام زیادہ تھا آج اس لئے چھٹی نہیں مل سکی۔“ اروئی اصل بات پہ پردہ ڈال گئی تھی۔

لیکن جرار، اروئی سے زیادہ تیز نکلا تھا اس نے ہمیشہ کی طرح اپنی وکالت کے لئے اپنی بہن کو فون کر کے بھڑکا دیا تھا۔

”اروئی ادھر آؤ میری بات سنو۔“ رات کو وہ عشاء کی نماز پڑھ کر سونے کی تیاری کر رہی تھی جب شمینہ بھابی نے اروئی کو چھت پہ بلایا تھا

اروئی فوری طور پر کچھ بھی سمجھ نہیں پائی تھی لیکن جب بھابی کے عین سامنے پہنچی تو ذہن میں دو پہر والی بات کو مندے کی طرح لپکی تھی۔

”جی کہئے خیریت ہے نا؟“ وہ جان بوجھ کر انجان بنتے ہوئے بولی تھی۔

”خیریت کہاں ہے بھلا؟ جرار کا فون آیا تھا وہ بتا رہا تھا کہ اس کے دوستوں کی ایک لڑکی سے کافی دنوں سے تو تو، میں میں، چل رہی تھی

اس لئے آج وہ لوگ اس لڑکی کو ڈرانے دھمکانے کے ارادے سے اپنے ساتھ لے گئے اور وہ لڑکی سچ مچ ان سے ڈر کے بھاگ کھڑی ہوئی اور اس کا

تم سے ٹکراؤ ہو گیا۔“

”بھابی آپ نے مجھے کس لئے بلایا تھا؟“ اروئی ان کی بات نظر انداز کرتے ہوئے سنجیدگی سے بولی تھی۔

”میں نے تمہیں اس لئے بلایا تھا کہ تم جرار کے بارے میں جو کچھ بھی سمجھ رہی ہو وہ سب غلط ہے وہ ایسا کر ہی نہیں سکتا اس لئے تم کوئی بے

بنیاد الزام لگا کر گھر والوں کو کچھ مت بتانا جو بات جہاں ہے اسے وہاں ہی رہنے دو۔“

”کیوں رہنے دو بھابی؟ کیا وہ آپ کا لاڈلا چھینتا بھائی ہے اس لئے؟ آج ایک شریف خاندان کی عزت وہ دوستوں کے ساتھ مل کر تباہ کرنے

جارہا تھا اس کی کوئی پروا نہیں ہے آپ کو؟

آپ صرف اس پہ یقین کر رہی ہیں جو آپ کا بھائی کہہ رہا ہے؟ ایک لڑکی کے سر سے دو پتہ چھین لیا جائے اس پہ تشدد کیا جائے اسے

سنان علاقے میں لے جا کر زیادتی کے گھناؤنے عزائم سے زد و کوب کیا جائے اور بعد میں کہا جائے صرف ڈرایا دھمکایا تھا کیا آپ کے خیال میں یہ

سب ہی سچ ہے؟“ اروئی پھٹ پڑی تھی۔

”آہستہ بولو اروئی لوگ سنیں گے۔“ بھابی نے اسے گھورا تھا۔

”جس طرح آپ کو لوگوں کی فکر ہے اسی طرح ہر ماں باپ کو اپنی بیٹیوں کی عزت کی فکر ہے آپ اپنے بھائی کی وجہ سے اس کی غلطی اس

کے گناہ سے آنکھ چرا رہی ہیں مگر ساری دنیا تو ایسا نہیں کر سکتی نا؟ وہ تو اس لڑکی کے گھر والے شریف لوگ تھے اس لئے معاملہ پولیس تک نہیں جانے دیا

اگر وہ لوگ پولیس کو بتاتے تو میں بھی یقیناً جرار کے خلاف ضرور گواہی دیتی کیونکہ چشم دید گواہ تو میں ہی تھی نا؟“

”دیکھو اروئی اللہ کے لئے آہستہ بولو، آس پاس والوں نے یا گھر میں کسی نے سن لیا تو کیا سوچیں گے ٹھیک ہے میں مانتی ہوں کہ وہ غلط



ہے اور اس کی غلطی کے لئے میں معافی مانگنے کو تیار ہوں وہ میرا ایک ہی تو بھائی ہے میں اب اس کے ساتھ اور کیا کروں؟“ خلاف توقع بھابی کا لہجہ نرم ہو گیا تھا اور انداز میں بے بسی اور شرمندگی اتر آئی تھی۔

اروئی نے بغور ان کے چہرے کا جائزہ لیا تھا انہوں نے ہاتھ جوڑ کے اروئی کو چپ رہنے کا کہا تھا اور اروئی بھلا کب تک کسی کے بندھے ہاتھوں سے نظر چرا سکتی تھی بالآخر خاموش ہو ہی گئی تھی کیونکہ اس کی بھابی رشتے اور مردوں میں اس سے بڑی تھیں اسے کچھ تو لاج رکھنا ہی تھی۔ جب وہ لڑکی جس پہ تشدد ہوا تھا وہ عزت کی وجہ سے چپ ہو کے بیٹھ گئی تھی۔ اروئی تو پھر بھی صرف ایک گواہ تھی۔



”عارفین ادھر آؤ میری بات سنو۔“ وہ شاید کہیں باہر جا رہا تھا جب بابا جان کی آواز پہ لاؤنج میں چلا آیا تھا بی بی جان بھی وہاں ہی تھیں اور حانی ان کی گود میں سو رہا تھا۔

”کیا تمہیں اپنی بیوی کی کوئی پروا نہیں ہے؟“ ان کے سوال پہ وہ یکدم چونک گیا تھا اس کا خیال اروئی کی سمت گیا تھا۔

”کیا مطلب بابا جان؟“ وہ الجھن بھرے انداز سے بولا تھا۔

”زونکہ گھر پہ رہے گھر سے باہر رہے، تمہیں کوئی احساس ہی نہیں ہوتا؟ میں دو دن سے دیکھ رہا ہوں وہ دوپہر کے وقت گھر سے نکلتی ہے اور فجر کے قریب واپس آتی ہے اور آج تو وہ واپس بھی نہیں آئی۔“ بابا جان کی بات پہ عارفین گہری سانس کھینچ کے رہ گیا تھا۔

”بابا جان کون سا ایسا مرد ہے جسے بیوی کے گھر سے باہر رہنے کا کوئی احساس ہی نہ ہو؟ احساس ہوتا ہے، مجھے بھی احساس ہوتا ہے۔ مگر میں اس احساس کے بعد کیا کروں؟ وہی کچھ جو میرے باپ نے کیا؟ یا پھر وہ جو ہماری سوسائٹی کے نوے فیصد مرد کر رہے ہیں۔“ عارفین کے جواب پہ بابا جان ٹھنک گئے تھے اور بی بی جان بھی چونک گئی تھیں۔ بیوی کی عیاشی کے بعد جو کچھ اس کے باپ نے کیا تھا وہ بی بی جان اور بابا جان کے لئے آج بھی ایک تازہ زخم کی مانند تھا اور وہ لوگ پوتے کو بھی اسی راہ پر ڈال رہے تھے؟

وہ دونوں اندر سے دہل گئے تھے حالانکہ بات بھی انہوں نے چھیڑی تھی۔

”دیکھ بابا جان! میرے والد محترم کی طرح گھر چھوڑ کر دنیا کی بھیر میں گم ہو جانا اس مسئلے کا حل نہیں ہے اور نہ ہی باقی مردوں کی طرح بیوی کے کرتوتوں سے چشم پوشی کر لینا اس کا حل ہے۔ بلکہ اصل تو یہ ہے کہ یا تو بیوی کو اپنے رشتے میں ایسا باندھ کر رکھو کہ وہ کہیں بھی جانے نہ پائے، اور اگر چلی جائے تو پھر واپس نہ آئے۔ ایک مشرقی مرد کی زندگی میں عیاش، بدکردار بیوی کی کبھی کوئی گنجائش نہیں ہوتی، اور اگر پھر بھی وہ اسے اپنی زندگی میں برداشت کرتا ہے تو اس برداشت کے پیچھے اس مرد کی کوئی بہت بڑی مجبوری یا پھر کمزوری ہوتی ہے، اور زونکہ وہ برداشت کرنے کے پیچھے میری سب سے بڑی مجبوری میری ماں ہے اگر کبھی میری یہ مجبوری پیچھے ہٹ جائے تو زونکہ کو طلاق کے تین جملے کہنے میں مجھے محض تین منٹ لگیں گے۔“ عارفین آج بات کرتے کرتے یکدم پھر گیا تھا زونکہ کی عیاشیوں کو برداشت کر کر کے اس کے صبر کا پیمانہ بھی لبریز ہو چکا تھا۔

”ارے نہیں بیٹا ہم ایسا نہیں کہہ رہے کہ تم زونکہ کو چھوڑ دو بلکہ ہم تو چاہتے ہیں کہ تم اسے آرام سے سمجھاؤ۔“ بابا جان نے بات سنبھالنے کی

کوشش کی تھی۔

”کیا میری ماں رابعہ شیرازی میرے باپ کے سمجھانے سے سمجھ گئی تھی؟“ عارفین نے متسخرانہ کہا تھا۔

”بابا جان زونکہ بھی رابعہ شیرازی کی بھانجی ہے وہ بھی وہی کرتی ہے جو اس کا دل کہتا ہے۔ میں ہر رات سوچتا ہوں کہ کچھ ایسا کروں تاکہ وہ میری زندگی سے دفع ہو جائے لیکن ہر صبح میں بے بس ہو جاتا ہوں کیونکہ میرے سامنے میری نام نہاد ماں کھڑی ہوتی ہے۔ جب ہماری بیوی، سب کی بیوی بنے تو پھر اسے اپنی بیوی بنائے رکھنا سب سے بڑی بے غیرتی ہے اور میں بہت عرصے سے یہ بے غیرتی کرتا چلا آ رہا ہوں لیکن جس روز برداشت کی حد ختم ہو گئی تب میں نہ کوئی مجبوری دیکھوں گا اور نہ ہی کوئی کمزوری۔“

”مگر بیٹا حانی کا کیا ہوگا؟“ وہ ماں ہے اس کی؟ وہ ماں کے بغیر کیسے رہے گا؟“ بی بی جان نے اسے حانی کا احساس دلایا تھا۔

”بی بی جان اب بھی وہ ”ماں کے بغیر“ ہی رہ رہا ہے۔“ عارفین کے کہنے کا مطلب کچھ اور تھا جبکہ وہ لوگ کچھ اور سمجھے تھے۔

”مگر بیٹا.....“

”بس بی بی جان جو کچھ جیسا چل رہا ہے فی الحال چلنے دیں انشاء اللہ سب بہتر ہی ہوگا۔“ وہ انہیں تسلی دینے والے انداز میں کہتا اٹھ کھڑا ہوا تھا اور پھر سر جھٹک کر باہر نکل گیا تھا وہ دونوں پریشان سے بیٹھے تھے صرف یہ سوچ کر کہ کیا بیٹا، باپ کی تاریخ کو دہرانے والا تھا؟

ڈاٹ کام



سبطین شیرازی کی نسبت بچپن سے ہی مہر النساء سے ملے ہو چکی تھی لیکن سبطین بہت ہی رنگین مزاج اور حسن پرست مرد تھا جبکہ اس کی چچا زاد کزن مہر النساء اس کے معیار حسن پہ ہرگز پورا نہیں اترتی تھی اس لئے وہ مہر النساء سے کترایا کترایا ساربتا تھا لیکن بابا جان کی کوشش یہی ہوتی تھی کہ سبطین کا رجحان مہر النساء کی طرف ہی ہو اور اس کے لئے وہ سبطین شیرازی کے روز و شب کا پورا پورا پہرہ دیتے اور اس کا دھیان رکھتے تھے۔

سبطین اور مہر النساء دونوں ہم عمر تھے اس لئے دونوں ایک ساتھ پڑھ رہے تھے حالانکہ سبطین کو مہر النساء کے ساتھ پڑھنے پہ بہت اعتراض ہوتا تھا مگر بابا جان کے سامنے اس کی دال ہرگز نہیں گلتی تھی وہ لاکھ ہاتھ پاؤں مارتا مگر بیچ نہیں پاتا تھا۔ بابا جان کو اپنی بن ماں باپ کی بھتیجی اتنی ہی عزیز تھی جتنا اپنا اکلوتا بیٹا عزیز تھا وہ کبھی بھی اس کی حق تلفی یا پھر نا انصافی نہیں ہونے دیتے تھے اس لئے جب سبطین نے کراچی یونیورسٹی میں ایڈمیشن لیا تو انہوں نے خود بہ خود ہی مہر النساء کا ایڈمیشن بھی اس کے ساتھ کروا دیا تھا۔

اس طرح کر کے بابا جان شاید اس کی آوارہ مزاجی کے آگے بند باندھ رہے تھے مگر کوئی مرد کسی بند باندھنے سے بند جائے ایسا کبھی پہلے ہوا تھا؟ جواب ہوتا؟ سبطین شیرازی کی نظر یونیورسٹی میں قدم رکھتے ہی رابعہ درانی پہ ٹھہری تھی اور اس سے آگے نہیں بڑھ سکی تھی مہر النساء بہت ہی سادہ سی اپنی ذات میں گم رہنے والی لڑکی تھی اسے ایک ہی یونیورسٹی اور ایک ہی کلاس روم میں رہتے ہوئے کبھی بھی سبطین اور رابعہ درانی کے عشق و عاشقی کی خبر نہیں ہوئی تھی۔ مگر بابا جان ان سے دور رہتے ہوئے بھی ساری خبر رکھتے تھے انہوں نے ایک روز سبطین شیرازی کو گھیر لیا تھا۔

”سبطین میں تمہیں آخری بار سمجھا رہا ہوں اپنی حرکتوں سے باز آ جاؤ ورنہ بہت برا انجام ہوگا تمہارا۔“ انہوں نے اسے وارننگ دی تھی۔

”میں رابعہ کو پسند کرتا ہوں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“ بالآخر اس نے کہہ دیا تھا۔

”کیا کہا؟“ بابا جان دھاڑا اٹھے تھے۔

”ہاں ٹھیک کہہ رہا ہوں میں مہر النساء کو پسند نہیں کرتا مجھے ایسی دقیانوسی بیوی نہیں چاہئے، میں ایسی بیوی چاہتا ہوں جو میرے قدم سے قدم ملا کر چلے، جو میرے ہر مسئلے کا حل ہونے کے خود ایک مسئلہ بن جائے۔“ اس نے مہر النساء کے خیال سے خفگی سے سر جھٹکا تھا۔

”تم ابھی نادان ہو سبطین شیرازی قدم سے قدم ملا کر چلنے والی بیویاں اکثر بہت آگے نکل جاتی ہیں اور پھر تم جیسے نام نہاد وغیرت مند کبھی بھی ان کے قدم سے قدم نہیں ملا پاتے کیونکہ ان کی رفتار تم لوگوں سے زیادہ تیز ہوتی ہے۔“ بابا جان نے بیٹے کو ملامت کی تھی۔

”آپ جو جی چاہے کہہ لیں مگر میری شادی صرف رابعہ سے ہی ہوگی یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔“ سبطین شیرازی باپ کے سامنے ڈٹ گیا تھا آخر حسن کے جس جال میں وہ پھنسا تھا وہاں کچھ اور نظر آ جاتا کبھی ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

سبطین شیرازی نے رابعہ درانی کو کورٹ میرج کے لئے اکسایا مگر رابعہ درانی کورٹ میرج نہیں بلکہ پراپر طریقے سے شادی کرنا چاہتی تھی تاکہ پورے شہر اور پوری یونیورسٹی کو پتہ چلتا کہ سبطین شیرازی اسے پسند کرتا ہے اور اسے بیاہنے آیا ہے مگر بابا جان کی یونیورسٹی آمد نے اس کے پرچے اڑا دیے تھے۔

”تم لڑکیوں میں سے رابعہ درانی کون ہے؟“ انہوں نے غضب ناک سے پوچھا تھا۔

”میں ہوں رابعہ درانی آپ کون ہیں؟“ رابعہ درانی جیسے تیرے سامنے آئی تھی۔

”سبطین کہاں ہے دو دن ہو گئے ہیں وہ گھر نہیں آیا۔“

”میں آپ کے سبطین کو اپنے پرس میں لے کر نہیں گھوم رہی، آپ کا بیٹا ہے آپ کو خبر ہونی چاہئے کہ وہ کہاں ہے؟“ وہ چڑ گئی تھی۔

”بیٹا میرا ہے مگر عاشق تو وہ تمہارا ہے نا؟ تم اسے آج کل اپنے پرس میں تو کیا اپنے دوپٹے کے پلو میں بھی لے کر گھوم سکتی ہو تمہارا دم چھلا بنا ہوا ہے۔“ بابا جان کا دل چاہ رہا تھا اس شاطر لڑکی کو کھڑے کھڑے گولی مار دیں جو یہ جانتے ہوئے بھی کہ سبطین شیرازی اپنی چچا زاد سے انکسج ہے، پھر بھی اس پر ڈورے ڈال رہی تھی۔

”آپ ذرا دھیان سے بات کریں بزرگوار، آپ کا بیٹا میرے پیچھے پیچھے گھوم رہا ہے، میں نہیں۔“ وہ نخوت سے بولی تھی۔

”میرے بیٹے کو دعوت نظارہ دیتی ہو تو وہ گھومتا ہے نا؟“ بابا جان کی بات پر رابعہ درانی کے چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا، وہ کھلم کھلا سب کے سامنے اس کی انسلٹ کر رہے تھے اور پھر دونوں میں اس قدر جھڑپ ہوئی کہ بہت سے لوگ جمع ہو گئے تھے۔

”بابا جان آپ یہاں؟ یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟“ مہر النساء ابھی ابھی کلاس روم سے باہر نکلی تھی اور بابا جان کو رابعہ درانی پر مشتعل ہوتے دیکھ کر گھبرا گئی تھی۔

”ہونہ بڑی آئی بابا جان کی چیتھی، تمہیں تو میں دیکھ لوں گی..... سبطین شیرازی میرا ہے اور میں اسے حاصل کر کے رہوں گی، دیکھتی ہوں کہ آپ بھی کیا کرتے ہیں؟“ اس نے سب کے سامنے ان کو چیلنج کیا تھا۔

”عیاش عورتیں اسی طرح پوری دنیا میں اعلان کرتی ہیں۔“ بابا جان آج حد پار کر رہے تھے۔

”میں بے شک عیاش ہی سہی، مگر آپ کی اس پاک دامن بی بی کو کبھی سبطین کی بیوی نہیں بنے دوں گی، یہ اس کے نام کو تو کیا صورت دیکھنے کو بھی ترے گی، میں اس بے عزتی کا بدلہ عمر بھر لوں گی آپ لوگوں سے۔“ رابعہ درانی کا چیلنج سچ ثابت ہوا تھا اس نے اسی دن سبطین شیرازی سے نکاح کر لیا تھا اور اسی رات وہ ”شیرازی ہاؤس“ میں آ گئی تھی جہاں آج کل بابا جان اور مہر النساء ٹھہرے ہوئے تھے۔

”یہ گھنڈا لڑکی میرے گھر میں داخل نہیں ہو سکتی۔“ بابا جان چیخے تھے۔

”بابا جان آہستہ بات کریں، یہ اب آپ کی بہو ہے۔“ سبطین شیرازی کا دونوک لہجہ بابا جان کو خاموش کروا گیا تھا۔ رابعہ درانی کا جادو اس کا نشہ سر چڑھ کے بول رہا تھا اور بابا جان مزید کچھ بھی سننے کی تاب نہیں رکھتے تھے۔ وہ اب وہاں ٹھہرنا نہیں چاہتے تھے، روتی بلکتی مہر النساء کو لے کر واپس گاؤں کے لئے روانہ ہوئے۔

”آئندہ کبھی شیرازی ہاؤس میں قدم مت رکھنے محترمہ مہر النساء..... ورنہ دھکے دے کر نکال دوں گی۔“ رابعہ درانی نے مہر النساء کے پیچھے فقرہ کستا تھا اور مہر النساء بے مروت سے کھڑے سبطین شیرازی کو ک نظر دیکھ کر شیرازی ہاؤس سے نکل گئی تھی۔ یہ وہ شیرازی ہاؤس تھا جس کے بابا جان نے خواب دیکھے تھے کہ سبطین اور مہر النساء یہاں ایک ساتھ رہیں گے۔ مگر.....





رابعہ شیرازی بسطین کے عشق میں ایسی اندھی بھی نہیں ہوئی تھی کہ اپنا اچھا برادیکھے بنا اس سے نکاح کر لیتی، اس نے بسطین شیرازی کے اکلوتے پین اور دولت، جائیداد اور جاگیر سب کچھ دیکھ اور پرکھ کر اس کو اپنے دام میں الجھایا تھا اور وہ ”حسن پرست“ بڑی آسانی سے الجھ بھی گیا تھا۔ پورا ایک سال ہو گیا تھا وہ نہ گاؤں گیا تھا نہ ہی کسی سے ملنے کی کوشش کی تھی۔ البتہ ایک سال بعد عارفین کی پیدائش پہ بی بی جان اور بابا جان خود ہی بن بلائے مہمان کی طرح ملنے آگئے تھے، لیکن رابعہ شیرازی کا رویہ ان کے ساتھ کچھ اچھا نہیں تھا۔ اس لئے وہ صرف پوتے سے مل کر ہی واپس چلے گئے تھے اور بسطین شیرازی انہیں روک بھی نہیں پایا تھا۔

وہ رابعہ شیرازی جو عارفین کی پیدائش تک پھونک پھونک کے قدم اٹھاتی آرہی تھی، ایک بچے کی ماں بننے کے بعد بالکل آزاد ہو گئی تھی۔ اس نے اپنا احتیاط کا چولا اتار پھینکا تھا۔ اب اس کے دن سوتے تھے اور راتیں جاگتی تھیں۔ عارفین گورنس کے ہاتھوں پل رہا تھا اور بسطین شیرازی اس کے رنگ ڈھنگ اور روٹین دیکھ دیکھ کر حیران ہوتا رہتا تھا، لیکن رفتہ رفتہ اسے احساس ہوا کہ رابعہ شیرازی محض پارٹیز میں ہی نہیں جاتی بلکہ اس کے کئی فرینڈز کے ساتھ تعلقات بھی ہیں اور اس کے تعلقات کی نوعیت سامنے آتے ہی اس کا دماغ گھوم گیا تھا۔ لہذا رابعہ شیرازی کے کرتوتوں کو جاننے کے بعد آئے روز ان کے بیڈروم میں جھگڑے ہونے لگے تھے۔ مگر بسطین شیرازی جو اپنی تمام کشتیاں جلا چکا تھا۔ وہ شکست خوردہ سا بیٹھا رہ گیا تھا اور اس مقام پہ آ کر اسے مہر النساء بہت شدت سے یاد آئی تھی، اور یہ مہر النساء کی طلب ہی تھی کہ وہ ہر بات بھلا کر واپس حویلی چلا آیا تھا۔ جہاں آج کل مہر النساء کے رشتے کی باتیں ہو رہی تھیں۔

”مہر النساء مجھے معاف کر دو۔“ اس نے مہر النساء کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے تھے۔

”معافی کیسی بسطین؟ تم اپنی زندگی، اپنی مرضی کے مالک تھے، تمہیں جو اچھا لگا تم نے کیا، اس میں معافی کا تو کوئی سوال ہی نہیں اٹھتا؟“

”نہیں مہر النساء میں تمہارا مجرم ہوں، تم بچپن سے میرے نام سے منسوب تھیں اور میں نے چند دنوں میں اتنا گہرا رشتہ.....“

”بسطین خونی رشتوں کے علاوہ کوئی بھی رشتہ گہرا نہیں ہوتا، بس اب یہی دیکھ لو ہم دونوں منگیتر نہیں ہیں، مگر چچا زاد کزن اب بھی ہیں۔ ہمارا صرف ایک رشتہ ہے جو حقیقتاً ایک کچا رشتہ تھا اور کچے رشتوں کے ٹوٹنے پہ دل اتنا چھوٹا بھی نہیں کرنا چاہئے کہ بندہ کسی اور کام کا ہی نہ رہے۔ مجھے بھی شروع شروع میں یہی لگا تھا کہ میری دنیا ختم ہو گئی ہے۔ مگر اب پتہ چلا ہے کہ میری دنیا صرف ”تم“ ہی نہیں تھی میری دنیا تو بی بی جان بھی ہیں، میری دنیا تو بابا جان بھی ہیں، میری دنیا یہ حویلی ہے، یہ گاؤں ہے..... میری دنیا بہت وسیع ہے بسطین، ایک تم نہ ہوئے تو کیا ہوا بھلا؟“ مہر النساء نے اسے اس کی اہمیت جتنا کر بھی بے وقعت کر ڈالا تھا۔

”میں تمہاری دنیا نہ سہی مہر النساء مگر تم میری دنیا ضرور بن چکی ہو، تم مجھے بے شک اہم نہ جانو، لیکن تم میرے لئے کتنی اہم ہو، میں ان دو سالوں میں اچھی طرح جان چکا ہوں۔ پلیز مہر النساء مجھے اپنالو، مجھے معاف کر دو۔ میں تمہاری طرف واپس پلٹنا چاہتا ہوں۔“ ہتھیار ڈال دیئے تھے، مگر مہر النساء کبھی مر کے بھی کسی کی سوتن نہیں بن سکتی تھی اس نے ہزار منتوں اور واسطوں کے باوجود بسطین شیرازی کو واپس لوٹا دیا تھا اور ساتھ والے گاؤں سے آنے والے پرپوزل کے لئے حامی بھر لی تھی، اس کی شادی کی خبر سن کر بسطین شیرازی ایک بار پھر حویلی بھاگا آیا تھا۔ اس

نے مہر النساء کو ہر ممکن طریقے سے اس شادی سے منع کیا تھا۔ مگر وہ باز نہیں آئی تھی اور مہر النساء کو ہمیشہ کے لئے کھودینے کا احساس بطن شیرازی کو روگ کی طرح لگ گیا تھا۔

رابعہ شیرازی کو شوہر کی دیوانگی کا علم ہوا تو وہ ہتھے سے اکھڑ گئی تھی۔ اس نے ایک بار پھر دنگا فساد مچایا تھا۔ مگر اس کے اطمینان کے لئے یہ کافی تھا کہ مہر النساء کی شادی ہو گئی ہے۔

”ابھی تک اپنی جیتی کاروگ لئے بیٹھے ہیں؟ وہ تو اپنے شوہر کے ساتھ عیش کر رہی ہوگی اور آپ کو فقیر بنا کے یہاں بٹھا گئی ہے۔“ رابعہ شیرازی نے زہر خند لہجے میں کہا تھا۔

”کاش اس نے بہت پہلے مجھے اپنا فقیر بنا دیا ہوتا تو میں آج تمہاری یہ مکروہ شکل بھی نہ دیکھتا۔ کاش مجھے پہلے پتہ ہوتا کہ میں ایک نایاب ہیرا ٹھکرا کر تم جیسا بدکردار نا کارہ پتھر سینے سے لگا رہا ہوں۔ کاش مہر النساء میری ہو جاتی۔“ بطن شیرازی رو، رو کے اپنی قسمت کو کوستا تھا اور رابعہ شیرازی، مہر النساء کا نام سن سن کر پراگل ہوتی رہتی تھی، اور پھر تین سال رابعہ شیرازی کی بد چلنی کا داغ سینے پہ سہہ کر بطن شیرازی کو جب کوئی بھی راستہ نہ ملا تو اس نے ایک رات خاموشی سے گھر چھوڑ دیا تھا۔

اس میں اتنا حوصلہ نہیں تھا کہ اپنے دکھ، اپنی چوٹیں بابا جان کو دکھاتا۔ اس نے صرف مہر النساء کو سب دکھایا تھا اور جب وہ بھی پرانی ہو گئی تو اس کے پاس واپسی کا کوئی راستہ نہیں بچا تھا۔ بے شک اس کے ماں، باپ اسے دوبارہ قبول بھی کر لیتے، مگر وہ ندامت اور پچھتاوے کا بوجھ لے کر سر اٹھا کے جی نہیں سکتا تھا۔ اس لئے ایک عجیب راہ فرار کا انتخاب کیا تھا جو سننے والوں کو حیران پریشان کر گیا تھا۔



یہ دھچکا بابا جان کے لئے کچھ کم نہیں تھا۔ وہ غصے کے بہت تیز تھے۔ وہ مشتعل ہو کر رابعہ شیرازی کو ”شیرازی ہاؤس“ سے نکال بھی سکتے تھے۔ مگر پوتے کا خیال کر کے انہوں نے رابعہ شیرازی کو بھی برداشت کر لیا تھا اور یہاں آ کر رابعہ شیرازی ایک بار پھر اپنے آپ کو ان پہ حاوی سمجھنے لگی تھی، کیونکہ ان کے اکلوتے بیٹے کا اکلوتا وارث ان کی منہی میں تھا اور پھر اس نے عارفین کی ذات کو ہمیشہ کیش کیا تھا۔ شادی کے چار سال بعد مہر النساء دو بیٹیوں کے ہمراہ بیوگی کی چادر اوڑھے واپس حویلی آ گئی تھی۔ اس کے سسرال والوں کا رویہ اس کے ساتھ اچھا نہیں تھا۔ اس لئے اس نے سسرال والوں کو چھوڑ دیا تھا۔

صرف ایک بابا جان تھے جو ہر دھچکے، ہر مصیبت، ہر دکھ کو دل پہ سہارتے پھر رہے تھے۔ انہوں نے پوتے کی پرورش کی تھی۔ انہوں نے مہر النساء کو سنبھالا تھا۔ انہوں نے مہر النساء کی بیٹیوں کو سینے سے لگایا تھا اور سب سے بڑی بات کہ اپنی ذات کو کبھی نکھر نے نہیں دیا تھا۔ اتنا سب کچھ سہہ کر بھی ان کا حوصلہ بلند ہی رہتا تھا۔





”کیسی ہو روئی؟“ وہ..... گھر میں داخل ہوئی تو جراث، امی اور بہروز بھائی کے پاس بیٹھا نظر آیا تھا۔ اروئی کے تن بدن کو آگ چھو گئی تھی۔ وہ کتنی دیدہ دلیری سے اسے مخاطب کر رہا تھا۔ یہ سب اس کی بہن ثمینہ بھابی کے کرشمے تھے۔ حالانکہ اروئی نے اسے اپنے گھر میں داخل ہونے سے منع کیا تھا۔

”لگتا ہے اروئی کا موڈ آف ہے؟“ جراث بے تکلفی سے بولا تھا۔  
 ”تھکی ہوئی آئی ہے، بیٹا اتنے کام کر کے موڈ خراب ہوئی جاتا ہے، وہ اکیلی ہم سب کا بوجھ اٹھا رہی ہے۔ اس کی ہم عمر لڑکیاں تو فیشن کرتے نہیں تھکتیں، وہ تو پھر ہمارے اور گھر کے چکروں میں پڑی رہتی ہے۔“ امی کو اس کی تھکن کا بہت احساس ہوتا تھا۔  
 ”اروئی کی شادی کے لئے بھی کچھ سوچا ہے یا نہیں؟“  
 ”بس بیٹا کوئی اچھا سوالی آگیا تو اللہ کا احسان مانوں گی۔“

”ہوں ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔“ جراث آہستگی سے بولا تھا اور پھر چند دن بعد ہی اس نے اپنا پرپوزل بھیج دیا تھا۔ جس پہ گھر والے تو پرسکون تھے۔ مگر اروئی اندر ہی اندر بھڑک گئی تھی اور اس نے کچھ بھی سوچے سمجھے بغیر ناصر جراث کے منہ پہ انکار کیا تھا، بلکہ اچھی خاصی عزت افزائی بھی کر دی ڈالی تھی، جس کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ عارفین اور اروئی دونوں میڈیا کی زد میں آ گئے تھے اور آج دونوں کو خبر نہیں تھی کہ کون کہاں ہے؟



صبح کا کھڑا روشن ہو چکا تھا، سورج کی کرنیں صبح کے چہرے کا سنگھار بنی ہوئی تھیں اور اروئی کے آنسو اس کے رخساروں پہ لکیر کی صورت نقش ہو چکے تھے۔ ساری رات اس نے ہسپتال کے بستر پہ جاگتے گزاری تھی۔ اس کی آنکھیں رتھکے اور آنسوؤں کے بوجھ سے بوجھل اور سوجی ہوئی تھیں، دل کے زخم، آنکھوں کے زخموں سے زیادہ گہرے اور دردناک تھے۔ اسے اپنوں نے ٹھکرا دیا تھا۔ اس کی غلطی، اس کا گناہ، اس کا قصور جاننے کی بھی کوشش نہیں کی تھی، اتنی جلدی اس کے وجود سے آنکھیں چرائی تھیں کہ وہ ان کے آنکھ چرانے کا صدمہ ہی نہ سہہ پار ہی تھی..... اور اس کی آنکھیں بار بار جلتے ہوئے پانیوں سے لبریز ہوئی جا رہی تھیں۔

”بیٹا کس چیز کا دکھ رہا رہا ہے تمہیں؟ اپنوں نے بدل جانے کا؟ یا پھر اکیلے رہ جانے کا؟“ وہ خاتون اپنے آنسو پونچھ کر اس کے سر کو تھپکتے ہوئے بولی تھیں۔

”مجھے خود پتہ نہیں کہ مجھے کس کس چیز کا دکھ رہا رہا ہے؟ اپنا شوہر ہوتے ہوئے بھی اس کے نہ ہونے کا دکھ، اپنی متا پیاسی رہ جانے کا دکھ، اپنے گھر والوں کی طوطا چشی کا دکھ، اپنے بھائی کے سفاک لفظوں کا دکھ، اپنی رسوائی کا دکھ، اپنی در بدری کا دکھ..... میرا دکھ کوئی ایک ہو تو میں بتاؤں نا؟ میں اتنے رشتوں کے ہوتے ہوئے بھی بے گھر ہوں..... میرا کوئی گھر ہی نہیں ہے، میرا کوئی اپنا نہیں ہے، میرے رہنے کے لئے چھت نہیں ہے، میرے لئے کچھ بھی نہیں ہے..... کیا کسی کو بھی میرا احساس نہیں؟ کسی کو میری اتنی بھی پروا نہیں کہ میں اکیلی کہاں جاؤں گی؟ کہاں رہوں گی؟ کیا کروں گی؟ کیا یہ ہی ہوتے ہیں اپنے؟“ وہ کہتے کہتے تڑپ تڑپ کر رونے لگی تھی اور وہ خاتون دوبارہ سے اسے سمجھانے اور بہلانے میں لگ گئی تھیں، وہ

اسے تسلی دلا سہ دے رہی تھیں، ڈھارس بندھا رہی تھیں۔ مگر اروئی کا اتنی جلدی سنبھل جانا بھی آسان نہیں تھا۔

”تم میرے ساتھ چلو، مجھے اپنی ماں سمجھو، میں تمہیں کبھی کوئی دکھ نہیں پہنچنے دوں گی، جو ہو گیا سو ہو گیا، حوصلہ کرو اب۔“ انہوں نے اروئی کا سر کندھے سے لگا لیا تھا، اور پھر ڈاکٹر زکے ڈسپانچر کرتے ہی انہوں نے رات بھر کے بل پے کئے اور ڈرائیور کو گاڑی نکالنے کا کہا تھا۔

<http://kitaabghar.com>

”صاحب وہ کل شام آپ کی پی اے آئی تھیں آپ سے ملنے، شاید کوئی کام تھا، کافی پریشان لگ رہی تھیں۔“ عارفین ناشتہ کر رہا تھا، جب چوکیدار ڈانٹنگ روم میں داخل ہوا تھا۔

”کیا؟ تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا تھا؟“ عارفین یک دم پریشان ہوتے ہوئے ناشتہ وہیں چھوڑ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

”صاحب کل شام آتے ہی آپ بیڈ روم میں چلے گئے تھے، اس لئے میں بتا نہیں سکا تھا۔“

”اوہ مائی گاڈ پتہ نہیں کس حال میں ہے وہ، اور کیا پریشانی تھی اسے؟“ وہ زیر لب بڑبڑاتا اپنا سیل فون اٹھا کر باہر نکل آیا تھا۔ اروئی کے نمبر پر ٹرائی کیا جو مسلسل آف جا رہا تھا۔

”کہاں جا رہے ہو عارفین؟ تم اس لڑکی کا پیچھا کیوں نہیں چھوڑ رہے پورے میڈیا میں گندہ کر کے رکھ دیا ہے اس نے..... کتنی بار کہہ چکی ہوں کہ وہ حرف لعنت کے بھیجو اور فارغ کرو اسے۔“ رابعہ شیرازی سیزرھیاں اتر کر قریب آگئی تھیں۔ عارفین نے پہلے ان کو، پھر زونلہ کو دیکھا انداز جلا دینے والا تھا۔

”بہت جلد ایسا ہی کروں گا مگر مت کریں۔“ وہ دبے لہجے میں کہہ کر آگے بڑھ گیا تھا اور رابعہ شیرازی کا دل خوش ہو گیا تھا۔ گویا عارفین کو اس رسوائی کے بعد عقل آگئی تھی۔ وہ اروئی سے رابطہ نہ ہونے کی صورت میں دل میں ایک فیصلہ کر کے اروئی کے گھر پہنچ گیا تھا۔

”کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟“ چھوٹے سے دروازے پہ دستک دے کر انتظار کرنے کھڑا ہوا تو اندر کی بے چینی بڑھنے لگی تھی اور اسی بے چینی کے دوران اسے سارہ کی صورت نظر آئی تھی۔

”جج..... آئیے۔“ وہ چاہہ کر بھی اسے انکار کی ہمت نہیں کر پائی تھی اور فوراً پیچھے ہٹ کے اسے راستہ دیا تھا۔

”آپ یہاں؟“ ثمنینہ بھائی اور بہروز بھائی، عارفین شیرازی کو دیکھ کر چونک گئے تھے اور پھر اگلے ہی پل بہروز بھائی کے ماتھے پہ بل پڑ گئے تھے اور چہرے پہ ناگواری نظر آنے لگی تھی۔

”میں اروئی سے ملنے اور آپ سے بات کرنے آیا ہوں۔“ وہ ڈائریکٹ بہروز بھائی سے مخاطب ہوا تھا۔

”لیکن ہمیں آپ کی کوئی بات نہیں سننی، آپ یہاں سے جاسکتے ہیں۔“ بہروز بھائی کا میٹھا لہجہ آج بہت تلخ ہو رہا تھا۔ انداز میں بے مروتی اور بدعاطی تھی۔

”میں اروئی سے ملے بغیر نہیں جاؤں گا۔“ وہ سختی سے بولا تھا۔



”نہیں ہے وہ یہاں، اس کا گندہ ٹاپاک وجود اس قابل نہیں تھا کہ اسے اپنے پاس رکھا جائے۔ وہ غلیظ آپ کے ساتھ ہی اچھی لگ سکتی ہے، اس لئے اسے آپ کے پاس بھیج دیا ہم نے..... نکال دیا ہے اس گھر سے..... دفع ہو گئی ہے وہ یہاں سے۔“ ثمنینہ بھابی انتہائی حقارت سے بولی تھیں اور عارفین یک دم تڑپ اٹھا تھا۔

”کیا کہا؟ آپ نے اسے گھر سے نکال دیا؟ آپ نے اروٹی کو گھر سے نکال دیا؟“ وہ حیرت کے مارے پاگل ہونے لگا تھا۔

”ہاں ہاں ہم نے اسے نکال دیا ہے، وہ گند کی پوٹلی۔“

”شٹ اپ..... جسٹ شٹ اپ..... اپنی زبان کو لگام دیں، ورنہ زبان کھینچ لوں گا آپ کی۔“ وہ یکدم دھاڑ اٹھا تھا۔ آج اس کے صبر، اس کے برداشت کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا۔ وہ ہمیشہ سب کا لحاظ اور مروت کرتا آ رہا تھا۔ مگر یہ دنیا بدلتی جا رہی تھی اور بے مروتی کی دنیا تھی۔ اس کے ساتھ اس جیسا بن کے رہنا پڑتا تھا۔

”اروٹی میری بیوی ہے۔ میری عزت ہے، اس کے بارے میں ایک لفظ بھی غلط کہا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔ اسے گند کی پوٹلی کہنے والے ذرا یہ تو سوچ لیں کہ آپ خود کیا چیز ہیں؟ آپ کا بائو ڈینا کیا ہے آخر؟ اونہد ایک ادب باش بھائی کے سوا اور ہے ہی کون آپ کا؟“ وہ پانچ سینکڑ میں ثمنینہ بھابی کی طبیعت صاف کر چکا تھا اور بہروز بھائی پھٹی پھٹی آنکھوں سے ہکا بکا سے بیٹھے عارفین شیرازی کو دیکھ رہے تھے۔

”آپ لوگ اس لڑکی پہ الزام تراشی کر رہے ہیں، جس نے آپ لوگوں کی خاطر اپنا آپ تک بیچ ڈالا؟ آپ کے علاج کی خاطر کہاں کہاں نہیں پہنچی وہ؟ کس کس سے قرض کی بھیک نہیں مانگی اس نے؟ اپنی انا، اپنی عزت نفس، اپنا غرور بیچ کر آپ کا علاج کروایا ہے اس نے، اپنی ذات گروی رکھی تھی اس نے، اپنی ممتا، اپنی اولاد کا سودا کیا تھا اس نے، صرف آپ کی زندگی بچانے کے لئے اور اس خاتون کا سہاگ سلامت رکھنے کے لئے..... اس نے آپ کی ممتا کو دکھ کے عذاب سے بچالیا۔ مگر اپنی ممتا کو جدائی کے امتحان میں ڈال دیا، صرف آپ لوگوں کی خاطر۔“ وہ کہتے کہتے ماں جی کی طرف پلٹا تھا۔

”آج تک اگر وہ اس گھر کا سہارا نہ بنتی تو کب کے آپ لوگ سڑک پہ آچکے ہوتے، آپ کو بیوی بچوں سمیت در، در بھیک مانگنا پڑتی۔ اس وقت آپ لوگ مجبور تھے۔ آپ لوگوں کی آنکھوں پہ غربت کی پٹی بندھی ہوئی تھی، اس وقت وہ جھوٹ بھی بولتی تو آپ لوگوں کو بچ لگتا تھا اور آج جب آپ کو لگتا ہے آپ کا مشکل وقت نکل چکا ہے تو آج اس کا بچ بھی آپ کو جھوٹ لگ رہا ہے؟ اس وقت آپ کی عزت اور غیرت کہاں تھی جب آپ کے گھر کی اک اک چیز بک رہی تھی، جب آپ کا گھر بھی بکنے ہی والا تھا، آپ کوڑی کوڑی کے محتاج تھے۔ تب کہاں تھی آپ کی عزت..... ہر جاننے والے سے، ہر محلے دار سے قرض مانگا تھا آپ نے، تب غیرت کہاں تھی آپ کی؟ آج اس لڑکی کے دامن پہ کسی نے جھوٹا الزام لگا دیا ہے تو آپ کی غیرت جاگ اٹھی ہے؟ ہونہد آپ لوگوں کی خاطر رات رات بھر جاگتی تھی اور رات رات بھر روتی تھی، آپ لوگوں کے ذکر سے اس کا دن گزرتا تھا، وہ کہتی تھی میرا بھائی، میری ماں، میری بہنیں، میری بھابی..... میرے اپنے، لعنت بھیجتا ہوں ایسے اپنوں کی اپنائیت پہ..... میں سمجھتا تھا میرے گھر والے مفاد پرست اور خود غرض ہیں، مجھے یہ نہیں پتہ تھا کہ میری بیوی کے گھر والے بھی کچھ کم نہیں ہیں۔ صرف میری ماں ہی مطلب پرست

نہیں یہاں تو ہر ماں مطلب پرست ہو چکی ہے۔“ اس نے ماں جی کو تنگی سے دیکھ کر سر جھٹکا تھا۔

”آج کل کے دور میں جو بھی اپنوں کے لئے کوئی قربانی دے گا، الٹا وہی اپنوں کا مجرم کہلائے گا۔ آج کے دور میں کسی کے ساتھ بھلا کرنا سب سے بڑا گناہ اور بے غیرتی ہے۔“ عارفین سالوں کی بھڑاس نکال رہا تھا۔

”مجھے پتہ تھا اروئی کے ساتھ کوئی نہ کوئی مسئلہ ضرور ہوا ہوگا، اس لئے میں سارے پروف ساتھ لے کر آیا ہوں، یہ اروئی کے ایگری منٹ پیپر ہیں اور یہ نکاح نامہ۔“ اس نے ہاتھ میں پکڑے رول کئے ہوئے کاغذات بہروز بھائی کی چار پائی پہ پھینک دیئے تھے۔

”اور آج کے بعد کسی نے بھی اس کی طرف انگلی اٹھائی تو میں ہاتھ توڑ کے رکھ دوں گا۔ اور ہاں جاتے جاتے آپ کو اتنا بتا دوں آپ کا چہیتا بھائی اس وقت جیل میں ہے، اگر چھڑانے کی ہمت ہوئی تو چھڑا لیجئے گا، میں کل رات اس کا سارا بندوبست کر کے آیا تھا جو کام بہت پہلے ہونا چاہیے تھا وہ اب ہوا ہے۔ اللہ حافظ چلتا ہوں، مجھے اروئی کو ہر حال میں تلاش کرنا ہے، کیونکہ میرا بیٹا اپنی ماں کے بغیر رہ رہ کر ٹنڈا ہوا گیا ہے۔“ وہ جاتے جاتے جان بوجھ کر بہت کچھ جتا گیا تھا، جہاں باقی سب دم بخود ششدر سے بیٹھے تھے وہیں ثمنینہ بھائی تڑپ اٹھی تھیں کہ ان کا بھائی جیل میں تھا۔



مہر النساء کی گاڑی جیسے ہی حویلی میں داخل ہوئی تھی بابا جان پریشان سے قریب آگئے تھے۔

”بیٹا زیادہ پریشانی والی بات تھی تو مجھے بتا دیتیں، میں ہسپتال آجاتا؟“ وہ اپنی دھن میں بات کرتے کرتے چپ ہو گئے تھے اور اروئی گاڑی سے اترتے ہی ٹھٹھک گئی تھی۔ اس نے عارفین کے بابا جان کو چونک کر دیکھا تھا۔

”پریشان مت ہو بیٹا، یہ تمہارا اپنا گھر ہے، تم مالک ہو اس گھر کی۔“ مہر النساء نے مسکرا کر کہا تھا۔

”آپ..... آپ مہر النساء آنٹی ہیں؟“ اروئی نے حیرت سے دیکھا تھا۔

”ہاں میں تمہاری اور عارفین کی مہر النساء آنٹی ہوں۔ میں کل شہر ڈاکٹر سے چیک اپ کروانے گئی تھی اور اتفاق دیکھو کہ اللہ نے تم سے ملا دیا۔“ وہ اسے اپنے ساتھ لگائے اندر آگئی تھیں۔

”دیکھو بیٹا یہ سارا کھیل رابعہ باجی کا رچایا ہوا کھیل ہے، مجھ سے اور میری بیٹیوں سے بھاگتے ہوئے انہوں نے کبھی ذرا دیر کے لئے یہ بھی نہیں سوچا کہ اگر سوتن ہی بننا ہوتا تو بہت پہلے میں ان کی سوتن بن چکی ہوتی اور آج سبطین شیرازی کی راجدھانی پہ راج کر رہی ہوتی۔ مگر میں کبھی سوتن بننے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔ ایسے کام صرف وہ خود کر سکتی ہیں..... تم سے عارفین کا نکاح کروانے سے پہلے کاش وہ مجھ سے کچھ رابطہ کر لیتیں تو پھر میں ان کو بتاتی جو عورت خود کسی کی سوتن بننا پسند نہیں کرتی وہ اپنی بیٹی کو کسی کی سوتن کیسے بنا سکتی ہے؟ عارفین میری بیٹیوں کے لئے صرف ایک بھائی ہے اور ہمیشہ بھائی بن کے ہی رہے گا۔ صرف مجھ سے بھاگنے کے لئے انہوں نے نہ جانے کیسے کیسے کھیل کھیلے ہیں اور کیا کیا جال بچھائے ہیں۔ مگر افسوس کہ وہ خود اس جال میں پھنس چکی ہیں، ان کا کھیل ناکام ہو چکا ہے۔“ مہر النساء بہت ہی آرام اور تحمل سے بات کرتی تھیں اور اروئی حیران بیٹھی ان کی باتیں سن رہی تھی۔



رابعہ شیرازی اس عورت سے بھاگ رہی تھیں جو خود اپنی ذات میں انجمن تھی، جس کے سکون پہ رشک آتا تھا۔  
 ”مہر النساء کون ہے یہ لڑکی؟“ بابا جان کوئی کام بنا کر اندر آئے تو استفسار کر ہی لیا تھا۔  
 ”آپ کے پوتے کی بیوی ہے یہ، آپ کی بہو ہے۔“ مہر النساء مسکرا رہی تھیں۔

”بہو؟“ وہ اچنبھے سے بولے تھے اور مہر النساء نے ہاتھ پکڑ کر ان کے پاس بیٹھا لیا تھا اور رفتہ رفتہ عارفین کی داستان حیات سنانا شروع کر دی تھی، بابا جان کی آنکھیں کھلی جا رہی تھیں۔



آج رمضان کا پہلا دن شروع ہو رہا تھا اور ہر طرف رمضان المبارک کی تیاری اور خوشی کی گہما گہمی دیکھنے میں نظر آرہی تھی۔ حویلی میں بھی تیاریاں عروج پہ تھیں۔ سبھی لوگ خوش تھے۔ مگر بابا جان چپ سے چپ رہے تھے، جو کچھ ان پہ انکشاف ہوئے تھے وہ کچھ کم بھی تو نہیں تھے، سب کچھ اتنی جلدی اور اتنی آسانی سے قبول کرنے والا بھی نہیں تھا۔ لہذا ان کی خاموشی، ان کی سنجیدگی بجا تھی۔  
 ”کیا بابا جان میرے وجود کو قبول کرنے کی وجہ سے پریشان۔“

”ارے نہیں بیٹا تم کو غلط فہمی ہو رہی ہے، میں بابا جان کی رگ رگ سے واقف ہوں، وہ تمہاری وجہ سے نہیں صرف عارفین کی وجہ سے پریشان ہیں کہ ماں کے ایسے خطرناک کھیل اور عزائم میں وہ کب تک پھنسا رہے گا؟ کیا کرے گا آخر؟“ مہر النساء نے اروی کا ہاتھ تھپکتے ہوئے اسے تسلی دی تھی۔

اروی کو حویلی آئے ہوئے آج چار دن ہو چکے تھے، لیکن ان لوگوں نے ابھی تک عارفین کو اروی کے بارے میں نہیں بتایا تھا اور نہ ہی اس سے کوئی رابطہ کیا تھا۔ کیونکہ بابا جان یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ زندگی کے اس اہم اور حساس موڑ پہ آکر عارفین خود کیا کرے گا؟ یا پھر وہ کیا کر سکتا ہے؟ لہذا اب فیصلے اور انجام کی باگ عارفین کے ہاتھ میں تھی، اور عارفین کو یہ خبری نہ تھی کہ وہ بنا کسی چیلنج کے آزمایا جا رہا ہے، اس کے پیارے اسے پرکھ رہے ہیں۔  
 پورے گاؤں میں شام کے سائے ڈھلے جا رہے تھے اور پورا گاؤں شام کی لپیٹ میں آتا جا رہا تھا۔ آج سب کا پہلا روزہ تھا۔ سبھی گرمی، بھوک اور پیاس سے تھکے تھکے لگ رہے تھے۔ جب اچانک حویلی میں عارفین کی گاڑی آ کے ٹھہری تھی۔

”عارفین؟“ مہر النساء آنٹی فوراً کرسی چھوڑ کے کھڑی ہو گئی تھیں۔ عارفین نے جھک کر سیٹ پہ سوئے ہوئے حانی کو اٹھایا اور آگے بڑھ آیا تھا۔  
 ”غلامو بابا گاڑی سے میرا سامان نکال کے لے آؤ۔“ اس نے اندر بڑھتے ہوئے آواز دی تھی اور اس کی آواز پہ حانی کسمسا کے رہ گیا تھا۔  
 ”عارفین تم اس وقت، سب خیریت ہے نا؟“ مہر النساء آنٹی نے جلدی سے آگے بڑھ کے حانی کو اٹھا کر اپنے کندھے سے لگا لیا تھا۔  
 ”جی خیریت ہے، بابا جان کہاں ہیں؟“ اس نے چھوٹے ہی پوچھا۔

”اندر ہوں گے۔“ وہ اشارہ کرتے ہوئے خود بھی اس کے ساتھ ہی آگئی تھیں۔  
 ”عارفین میرا بچہ!“ بی بی جان نے اسے دیکھتے ہی بازو پھیلا دیئے تھے۔

”السلام علیکم بابا جان۔“ بی بی سے مل کر وہ ان کی طرف بڑھا تھا۔

”وعلیکم السلام۔“ ان کا انداز لیا دیا تھا۔ عارفین نے انہیں چونک کر دیکھا، ان کے مزاج کی خفگی دور سے ہی نظر آ رہی تھی۔

”یقیناً بابا جان کو بھی کہیں سے خبر ہو گئی ہوگی؟“ وہ دل ہی دل میں سوچ کر رہ گیا تھا۔

”بابا جان۔“ وہ آہستگی سے بولا تھا۔

”جی کیسے برخوردار، ہم سر رہے ہیں، آپ فرمائیے کیا فرمانا ہے؟“ لہجہ نگین بے چک اور دو ٹوک تھا۔

”میں نے آج وہ کام کیا ہے جو میرے بابا کو کرنا چاہیے تھا اور جو مجھے بھی بہت پہلے کر دینا چاہئے تھا۔“ عارفین کا سر جھکا ہوا تھا، انداز دھیمہ

تھا، مگر لہجہ مضبوط اور پُر سکون تھا۔

”ہتاؤ؟“

”بابا جان نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”میں نے زونل کو طلاق دے دی ہے اور شیرازی ہاؤس اپنی ماں کے نام لکھ کر خود ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس گھر کو چھوڑ دیا ہے۔ میری ماں

ہمیشہ مجھے گھر چھوڑ دینے کی دھمکی دے کر اموشن بلیک میل کرتی تھیں،۔ آج میں نے وہ کام کیا ہے کہ ان کو گھر بھی نہیں چھوڑنا پڑے گا اور میں بھی

آزاد ہو جاؤں گا، اب وہ اس گھر میں رہیں یا پھر چھوڑ دیں یہ ان کی مرضی..... میں وہ گھر چھوڑ آیا ہوں۔ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے وہاں آ گیا ہوں

جہاں میرے بابا کو ہونا چاہئے تھا۔“ عارفین کی بات پہ بابا جان کی آنکھوں میں چمک اتری تھی۔

”کیا یہ سب کر کے تم خوش ہو؟“

”ہاں میں خوش ہوں، کیونکہ اب میں صاف ستھری آزاد زندگی گزاروں گا لیکن بابا جان ابھی میں آپ کا مجرم ہوں، میں آپ سے شرمندہ

ہوں۔ میں نے اپنی ماں کے کہنے پہ آپ سے جھوٹ بولا تھا، آپ سے کچھ چھپایا تھا۔ جس کے لئے میں آپ سے شرمندہ ہوں، آپ پلیز مجھے معاف

کر دیں بابا جان، میں حالات اور واقعات کی وجہ سے مجبور تھا۔“ عارفین نے ان کے سامنے سر جھکا کر ہاتھ جوڑ دیئے تھے اور بابا جان دیکھتے رہ گئے۔

ایک یہ عارفین کی شرمندگی تھی جو ہاتھ جوڑ کے معافی کی طلب گار تھی اور ایک اس کے باپ بسطن کی شرمندگی تھی جس نے نظر تک نہ ملائی

اور ہمیشہ کے لئے منہ موڑ کر نہ جانے کہاں چلا گیا تھا اور بابا جان کے خیال میں اس شرمندگی سے یہ شرمندگی بہتر تھی جو اپنے گناہ، اپنی غلطی کا اعتراف

کر کے معافی مانگنے کا حوصلہ بھی رکھتی تھی۔ گویا کم حوصلہ انسان اگر اچھا کام نہیں کر سکتا تو پھر برا کام بھی نہ کرے۔

”بابا جان پلیز مجھے معاف کر دیں۔“ اس نے دوبارہ کہا تھا اور بابا جان نے آگے بڑھ کر اسے سینے سے لگالیا تھا۔

”ارے بیٹا معافی کیسی؟ جتنے اچھے کام تم نے سرانجام دیئے ہیں اس کے لئے تو تم معافی کے نہیں انعام کے حق دار ہو۔ آج تم نے مرد بن

کے دکھایا ہے، مردوں والا کام کیا ہے تم نے۔ دل خوش کر دیا ہے تم نے۔“ وہ اس کا کندھا تھپک کر بولے تھے۔

”انعام؟“



”ہاں بیٹا انعام..... ہم نے تمہارے لئے ایک لڑکی پسند کی ہے، بہت جلد ہم تمہاری شادی کر دیں گے۔ ہماری بہت خواہش تھی کہ تم ہماری پسند سے شادی کرو اور یہ لڑکی ہماری پسند اور تمہارا انعام ہے۔“

”مگر بابا جان..... وہ..... وہ حانی کی ماں۔“ عارفین چکرا گیا تھا۔

”یہ حانی کی ماں ہی ہوگی بیٹا، ایک مکمل پرفیکٹ ماں..... ایک سگی ماں۔“ وہ اسے تسلی دے رہے تھے، لیکن عارفین کی حالت دیکھنے والی تھی۔ وہ راجہ شیرازی سے بچ کے نکلا تو بابا جان کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔

”ایم سوری میں کوئی شادی نہیں کر سکتا، میں پہلے ہی شادی شدہ ہوں۔“

”دیکھو بیٹا سوچ لو۔“

”میں کچھ سوچنا نہیں چاہتا۔“

”عارفین ماں جاؤ یہ لڑکی بہت اچھی ہے، ہمیں بھی پسند ہے۔“ مہر النساء نے بھی کہا تھا۔

”میں نہ مان سکتا۔“

”پلیز سر مان جائیں نا۔“ اروئی کی دھیمی آواز پہ عارفین نے کرنٹ کھا کے دیکھا تھا، وہ بی بی جان کے پہلو میں بیٹھی دھیمے سے کہتے ہوئے مسکراتی تھی۔

”اروئی تم..... تم یہاں؟“ وہ بے ساختہ تیزی سے اس کے قریب آیا تھا۔

”یہ میرا گھر ہے، میں یہاں نہیں آؤں گی تو اور کہاں جاؤں گی؟“ اس نے..... پرسکون اور پراعتماد لہجے میں کہا تھا۔

”مگر..... تمہیں یہاں کا پتہ؟“

”مجھے میری آنٹی لے کر آئی ہیں، آپ اتنے پریشان کیوں ہو رہے ہیں؟“ اروئی نے خفگی سے کہا تھا اور عارفین نے حیرت سے مہر النساء کی سمت دیکھا تھا۔

”باقی ساری تفصیل روزہ افطار کرنے کے بعد سن لینا، چلو اذان کا وقت بس ہوا ہی چاہتا ہے۔“ مہر النساء نے سب کو فوراً اٹھنے کا حکم دیا تھا اور عارفین نے تو بمشکل افطار کیا تھا اور جلدی جلدی ساری تفصیل پوچھنے لگا تھا کہ اروئی یہاں تک کیسے پہنچی؟



عشاء کی نماز اور تراویح پڑھنے کے بعد وہ حویلی آیا تو سب ہی اپنے اپنے کمروں میں بند آرام کرنے جا چکے تھے۔ اس لئے وہ بھی مزید کہیں ٹھہرے بغیر اپنے بیڈروم کی طرف آ گیا تھا۔ آج پہلی بار ایسا ہو رہا تھا کہ اپنے بیڈروم کی جاتے ہوئے اس کے قدم سرشار، ریلیکس اور ہنسنے ہو رہے تھے۔ اس کی چال میں اپنی منزل، اپنی محبت، اپنا سکون پالینے کا نشہ ہمک رہا تھا۔ دل کی خوشی انگ انگ میں رچی ہوئی تھی۔ اس کے دل و دماغ میں سرور سا چھا رہا تھا۔ آج اس کے دل سے اس کے دماغ سے، اس کی ذات سے کئی بوجھ ہٹ گئے تھے۔ آج وہ ایک فریش پرسنالٹی محسوس ہو رہا تھا۔

وہ اپنے کمرے کے دروازے کے سامنے آکر زردادیر کے لئے ٹھہر سا گیا تھا۔ اندر سے اروئی کے بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ اپنے جذبول کا جہان آنکھوں میں آباد کئے اندر داخل ہوا تھا اور پہلی نظر کو ہی قرار آ گیا تھا۔ اروئی بیڈ پہ کھیلنے حانی کے اوپر جھکی، اسے بار بار چوم رہی تھی اور وہ اروئی کے چہرے کو چھو چھو کر خوش ہو رہا تھا۔ اس کی..... غوغاں اور قلقلیاں پورے کمرے میں بکھری ہوئی تھیں۔

”کیا سارا پیار آج ہی کرنے کا ارادہ ہے؟“ وہ بھی آکر حانی کی دوسری سائیڈ پہ بیٹھ گیا تھا۔

”میں اسے ساری عمر پیار کروں تو میرا پیار ختم نہیں ہوگا میری جان، میرا حانی آئی لو یو سوچ۔“ وہ کہتے کہتے اسے بھینچ کر پھر سے چومنے لگی تھی اور وہ خوش ہو رہا تھا۔

”ایسا ہی اظہار تم مجھ سے نہیں کر سکتیں؟“ عارفین نے اروئی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اسے اروئی کے ہاتھ بہت پسند تھے۔ وہ اکثر اس کی ہتھیلی پہ پیار کرتا تھا۔

”آپ کو میرے اظہار کی کیا ضرورت ہے؟“ اروئی کا انداز خفا سا تھا۔

”اروئی مجھے ہی تو تمہارے اظہار کی ضرورت ہے۔ مجھے آج تک کسی نے نہیں چاہا، میں سب کا مفاد بن رہا ہوں..... تم..... صرف تم ہو جو مجھے چاہو گی اور میری خوشی کی انتہا نہیں رہے گی۔“ عارفین کا لہجہ عجیب سا ہو رہا تھا۔ اروئی بے ساختہ اسے دیکھنے پہ مجبور ہو گئی تھی۔

”اور پھر مجھے کون چاہے گا؟“ اروئی نے بھی محبت مانگ لی تھی۔ عارفین مسکرا اٹھا تھا۔

”تم خود ہی تو کہتی ہو سہر دل کے حساب رہنے دیں یہ کبھی پورے نہیں ہوتے، دل کا کھاتہ اندھا ہوتا ہے کبھی بھرتا ہی نہیں ہے، چاہے حساب کتاب کے لئے کتنے ہی اوراق سیاہ ہو جائیں، اور آج میں بھی تمہیں یہ ہی کہوں گا کہ حساب دل رہنے دو..... بس محبت کو بغیر حساب کتاب کے چلنے دو۔ جتنی تمہیں میری چاہ ہوئی تم مجھے اتنا چاہ لینا اور جتنی مجھے تم سے محبت ہوئی، میں تمہیں اتنی محبت کر لوں گا، لیکن یا آج تمہیں یہ بھی بتا دوں کہ تم سے میرا رشتہ پہلی نظر میں ہی بن گیا تھا اور اس رشتے کا نام محبت تھا۔ یہ مجھے آج معلوم ہو رہا ہے۔“ وہ رفتہ رفتہ اسے اپنے قریب کرتا جا رہا تھا۔

”سرا ایک بات کہوں آپ سے؟“

”کہو میری جان کیا کہنا ہے؟“ وہ گھمبیر ہو جھل لہجے میں بولا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ ابھی ابھی نشہ کر آیا ہو۔

”میں نے ابھی عشاء کی نماز اور تراویح پڑھنی ہیں، آپ حانی کو سنبھالنے میں وضو کر لوں۔“

”ہائیں۔“ عارفین یکدم تڑپ کے حواسوں میں لوٹ آیا تھا۔

”مگر اروئی۔“

”سر میں نے صبح روزہ رکھنا ہے۔“ وہ سختی سے گھور کر بولی تھی۔

”یار میرے پاس کچھ دیر اور میٹھو پلیز میں تمہیں گڈ نیوز دیتا ہوں۔“

”کیسی گڈ نیوز؟“



”آج جب میں یہاں آ رہا تھا تب احمر انصاری نے مجھے کال کی تھی وہ تمہاری بہن سارہ کے لئے رشتہ لے کر جا رہے ہیں اور مجھے پوری امید ہے کہ اسے انکار نہیں ہوگا۔ سارہ اور احمر کی انگیج منٹ ہو جائے گی۔“ عارفین نے اسے بات بتاتے بتاتے دوبارہ سے ہانہوں میں بھر لیا تھا۔ اروئی کے چہرے کا رنگ بدلا تھا۔ مگر وہ فوراً ہی سنبھل گئی تھی۔

”مجھے ایسی گڈ نیوز سے کوئی سروکار نہیں ہے، سب کی اپنی اپنی زندگی ہے، جو جیسے چاہے جیسے ہماری بلا سے۔“ وہ سر جھٹک کر بولی تھی۔

”لیکن میں تو ویسے جینا چاہتا ہوں جیسے تم چاہو گی۔“ وہ گستاخی پہ مائل تھا۔

”میں بھی ویسے ہی جینا چاہتی ہوں سر..... میرا سب کچھ بھی صرف آپ ہیں۔“

”یاریہ بار بار سر کیوں؟“ وہ جھنجھلایا تھا۔

”تو پھر؟“ وہ استفہامیہ دیکھنے لگی۔

”عارفین صرف عارفین..... البتہ اگر موڈ ہو تو ساتھ میں ”جانو“ کا اضافہ بھی کر سکتی ہو۔“ وہ شوخ ہو رہا تھا۔

”نہیں نہیں صرف عارفین ہی کافی ہے۔“ وہ گھبرا کے بولی۔

”تو پھر کہو.....“

”عارفین۔“ وہ آہستگی سے بولی۔

”جی میری جان۔“

”مجھے جانے دیجئے، میں نے وضو کرنا ہے۔“

”ہائیں، پھر وہی بات؟“ وہ چپ ہو کے رہ گیا اور اروی بمشکل اپنا آپ چھڑا کر وضو کرنے چلی گئی اور وہ حانی کے ساتھ کھیلتا ہوا اس کے نماز سے فارغ ہونے کا انتظار کرنے لگا تھا۔

